تعلیم و تربیت

جولائی 2014

غم زدہ مینا کی فریاد
صفحہ نمبر: 28

شکار
صفحہ نمبر 60

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

بچوں کا دلچسپ رسالہ

تعلیم و تربیت

جولائی 2014ء

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ بلخ کے بادشاہ تھے۔ آپ نے کسی واقعے سے متاثر ہو کر دنیا ترک کر دی اور صحراؤں میں گھومتے پھرتے نیشا پور کے نواح میں چلے گئے۔ اپنی بادشاہت کے دنوں میں ہی اس فکر میں لگے رہتے کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کیسے ہو سکتی ہے۔ ایک رات وہ اپنے محل کے شاہی خواب گاہ میں نرم و نازک بستر پر آرام فرما رہے تھے اور ان کے محل کے چاروں طرف مسلح سپاہیوں کا پہرہ لگا ہوا تھا۔ اس دوران اچانک وہ نیند سے بیدار ہوئے۔ کیا سنتے ہیں کہ خواب گاہ کی چھت پر کسی کے چلنے پھرنے کی آواز آ رہی ہے اور وہ آہستگی سے آپس میں باتیں بھی کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ اٹھ بیٹھے اور سوچنے لگے کہ شاہی محل میں آدھی رات کو اس وقت یوں چوری چھپے داخل ہونے کی جرأت کس نے کی ہے۔ آخر سوچ بچار کے بعد اٹھ کر چھت کی طرف گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں نورانی شکلوں والوں کی ایک جماعت کھڑی ہے۔

بادشاہ نے پوچھا: ''تم لوگ کون ہو اور آدھی رات کے وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ان لوگوں نے عاجزی و انکساری کے ساتھ گردنیں جھکا لیں اور بولے: ''اے بادشاہ سلامت! ہم رات کے ابتدائی حصے سے اپنا گم شدہ مال ڈھونڈ رہے ہیں لیکن اس کا کہیں سراغ نہیں مل رہا۔'' بادشاہ نے سوال کیا: ''آخر کیا مال کھو گیا ہے جو تم ڈھونڈ رہے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''ہم اونٹ تلاش کر رہے ہیں۔'' بادشاہ نے حیرت سے کہا: ''اونٹ......؟ بھلا ایک اونٹ شاہی محل کی اس بلند عمارت پر کیسے چڑھ سکتا ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: ''اگر اونٹ اس عمارت کی چھت پر نہیں چڑھ سکتا تو شاہی تخت پر رونق افروز ہو کر خدا کو کیسے پایا جا سکتا ہے؟''

پیارے بچو! دین اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہمارے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، انبیاء کرام، خلفائے راشدین، شہدائے کربلا اور بزرگانِ دین نے اپنے آپ کو مشکلات میں ڈال کر اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا جس میں انھیں جسمانی و مالی اذیتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان بھی قربان کرنا پڑی اور شہادت کا عظیم رتبہ پایا۔ اس لیے پھولوں کی سیج پر بیٹھ کر، رعایا کی خدمت کیے بغیر اللہ تعالیٰ کی قربت اور خوشنودی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

ننھے ساتھیو! یقین ہے کہ آپ گرمیوں کی چھٹیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے ہوں گے کیوں کہ آپ نے پہلے سے چھٹیاں گزارنے کی منصوبہ بندی کر رکھی ہو گی جس میں کھیل کود، سیر و تفریح اور پڑھائی وغیرہ کا ٹائم ٹیبل بنایا ہو گا جس سے پڑھائی کے ساتھ وقت بھی اچھا گزرتا ہو گا۔

ہمیں امید ہے کہ آپ رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں سے بھرپور فیض یاب ہو رہے ہوں گے۔ اسی ماہ کے آخری دنوں میں عید الفطر منائی جائے گی۔ ہماری طرف سے خوشیوں بھری میٹھی عید کی پیشگی مبارک باد قبول کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی ہزاروں لاکھوں خوشیاں دیکھنی نصیب کرے۔ آمین!

لیجیے، اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی تنقید و تجاویز سے آگاہ کریں۔ آپ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

فی امان اللہ (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: ظلم (دو بہنا) کی فریاد

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت بذریعہ بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔

UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816

E-mail: tot.tarbiatfs@gmail.com

tot.tarbiatfs@live.com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 850 روپے
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے
ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے

قیمت فی پرچہ 30 روپے

حمدِ باری تعالیٰ

یا سبوح، یا قدوس، یا غفور
رحمتوں سے ہر بلا کر ہم سے دُور
ناتمامی ناصبوری اور نادانی میری
ہاں تیری رحمت سے میں نے پا لیا ہے شعور
عزت انسان ہے تجھ کو پسند میرے خدا
میری عزت رکھ تو مولا کر دعا منظور
بحرِ عصیاں میں خدایا ہم ہیں سب ڈوبے ہوئے
خیر کے نسخے عطا ہوں ہم سے نہ ہوں آپ دُور
اسوۂ محمد مصطفیٰؐ ہم پہ آساں بنا
اس سے رنگ لے کر بنے اپنے ملک کا دستور
ایسی آزادی خدایا پھر عطا کر دے ہمیں
جو شریعت بیعت کی ہو پابند ہر طرف حق کا ظہور
عرض کرتی ہے سراپا بن کے سائل یہ نسیم
یاد تیری ہی میں ہر دم رہوں نہ ہوں تجھ سے دُور

نعتِ رسولِ مقبولؐ

زمانے کی شاہی اگر چاہتے ہو
درِ مصطفیٰؐ کا گدا بن کے دیکھو
دکھوں کا مداوا اگر ڈھونڈتا ہے
محمدؐ سے تم دل لگا کے تو دیکھو
کوئی بھی نہ حسرت رہے دل میں باقی
نگاہ میں مدینہ بسا کے تو دیکھو
ہے روضے کی جالی میں آنکھوں کی ٹھنڈک
یہ نسخہ ذرا آزما کے تو دیکھو
انہی کے دوارے مٹے درد سارے
صدا یہ لگا کے ذرا تم تو دیکھو
یہ دل کی بیماری ضرور ختم ہو گی
وہ خاکِ شفا تم لگا کے تو دیکھو
نسیم گنبدِ خضرا بھی دیکھ لو گی
ارادہ ذرا یہ بنا کے تو دیکھو

مداوا: علاج۔ دوارے: دروازے پر۔
گدا: مانگنے والا، سائل۔

نسیم اختر نسیم

پیارے بچو! اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے ہم سب کو اپنے پیارے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے بنایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو بہت سے انعامات سے نوازا ہے۔ رمضان شریف کے بارے میں اس اُمت کو خاص طور پر پانچ خصوصیات سے نوازا ہے۔ یہ خصوصیات پہلی اُمت کے روزے داروں کو نصیب نہیں ہوئیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کو رمضان شریف کے بارے میں پانچ چیزیں خصوصی طور پر دی گئی ہیں جو پہلی اُمتوں کو نہیں ملی ہیں:

1۔ ان کے منہ کی بد بو اللہ کے نزدیک مشک (کستوری) سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

2۔ ان کے لیے دریا کی مچھلیاں تک دعا کرتی ہیں اور (وہ یہ دعا) افطار کے وقت تک کرتی رہتی ہیں۔

3۔ جنت ہر روز ان کے لیے سجائی جاتی ہے، پھر حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ عنقریب میرے نیک بندے (دُنیا کی) مشقتیں اپنے اوپر سے پھینک کر تیری طرف آئیں گے۔

4۔ رمضان میں سرکش شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ رمضان میں ان بُرائیوں کی طرف نہیں پہنچ سکتے جن کی طرف رمضان کے علاوہ مہینوں میں پہنچ سکتے ہیں۔

5۔ رمضان کی آخری رات میں روزہ داروں کے لیے بخشش اور معافی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا کہ یہ رات جس میں بخشش اور معافی کا اعلان ہوتا ہے (کیا) شب قدر ہے؟ فرمایا نہیں، بلکہ دستور یہ ہے کہ مزدور کو کام ختم ہونے کے وقت مزدوری دے دی جاتی ہے۔

(مسند احمد مسند المکثرین من الصحابۃ حدیث 7917)

اس حدیث پاک میں اُمت محمدیہؐ کے لیے رمضان کے حوالے سے پانچ خصوصی انعام ذکر فرمائے ہیں۔

پہلا انعام: روزہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا پسندیدہ عمل ہے کہ خالی پیٹ رہنے کی وجہ سے روزہ دار کے منہ سے اٹھنے والی بدبو مشک جیسی اعلیٰ خوشبو سے اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔

دوسرا انعام: روزہ ایسا پسندیدہ عمل ہے کہ مچھلیاں روزہ دار کے لیے دعا کرتی ہیں کہ ان روزہ داروں کو معاف فرما۔ اس لیے کہ جو رب تعالیٰ کی فرماں برداری کرتا ہے اور نیکی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی محبت اپنی مخلوق کے دل میں ڈال دیتے ہیں۔

تیسرا انعام: روزہ داروں کے لیے جنت کو آراستہ اور مزین کیا جاتا ہے۔

چوتھا انعام: رمضان کا مہینہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے جوش کا ہے اور اس میں عبادت کا بکثرت اہتمام کیا جاتا ہے، اس لیے سرکش شیاطین اس ماہ میں قید کر دیئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے گناہوں میں کمی کھلی آنکھوں سے دکھائی دیتی ہے۔

پانچواں انعام: رمضان کی آخری رات میں جس کا نام لَیْلَةُ الْجَائِزَة یعنی انعام کی رات۔ جس کو عرفِ عام میں ہم "چاند رات" کہتے ہیں، اس رات میں سب روزہ داروں کی بخشش کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔

پیارے بچو! جب رمضان شریف برکتوں والا مہینہ اور روزہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ عمل ہے تو آپ اس کی قدر کریں۔ کریں گے ناں......؟ جی! ضرور قدر کریں اور رمضان کے اوقات کو نماز، تلاوت، روزہ، ذکر وغیرہ سے قیمتی بنایئے۔ ☆☆

دادی اماں حسب معمول تخت پوش پر سفید چادر بچھائے بیٹھی تھیں۔ پان دان میں سے چھالیہ نکالی اور کترنے لگیں۔ جب انہوں نے سندیسہ کو پڑھائی میں مگن دیکھا تو بہت فکر مند ہوئیں۔ وہ سوچنے لگیں کہ یہ لڑکی پڑھ لکھ تو جائے گی مگر کل کو اس کی شادی بھی کرنی ہے لیکن گھر داری کی سمجھ بوجھ اور سلیقہ اس میں نہیں ہے۔ وہ تخت پوش سے اٹھیں اور اپنی بہو سے کہنے لگیں: ”نفیسہ بیگم! ذرا سندیسہ کو گھر داری کی طرف بھی مائل کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری بیٹی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اپنے پھوہڑ پن کی وجہ سے سسرال میں نادم ہو۔“

”امی جان بہت کہتی ہوں لیکن اسے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔“ نفیسہ بیگم نے جواب دیا۔

”سندیسہ کے بی اے کے امتحان کے بعد صغریٰ بی بی سے کہو اچھا سا رشتہ دکھائے۔“ دادی اماں نے نفیسہ بیگم کو ہدایت کی۔ ☆

”یہ کیا پکا ہے اور کس نے پکایا ہے؟“ محمد مرزوق نے دسترخوان پر پڑے سالن کو چکھ کر کہا۔

”سندیسہ نے پکایا ہے۔“ امی جان نے جواب دیا۔

”اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کا بیٹا تندرست رہے تو برائے مہربانی ایسے کھانے سندیسہ آپی خود ہی کھائیں۔ ہم پہ نہ آزمائیں۔“ محمد مرزوق نے طنز کیا۔

”بیٹا دسترخوان پر کھانے میں نقص نہیں نکالتے۔“ ابا جان نے سرزنش کی۔ ☆

ڈاکٹر فضل حسین کا خاندان بہت معزز، پڑھا لکھا اور وضع دار ہے۔ ان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ سندیسہ بڑی بیٹی ہے۔ دادی اماں یعنی فاطمہ زہرہ ایک سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔ ان کی بہو نفیسہ بیگم بھی بہت خوبیوں والی بہو ہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی بہت اچھی تربیت کی ہے لیکن سندیسہ کے معاملے میں کچھ خاص بہتری نہیں ہوئی۔ سندیسہ گھر داری سے بھاگتی ہے۔ دادی جان کہتی ہیں کہ تعلیم کے ساتھ ایک لڑکی کا فرض اور ذمے داری ہے کہ وہ گھر سنبھالنا جانتی ہو تاکہ ایک اچھے خاندان اور اچھی نسل کی بنیاد رکھ سکے۔ اب بھلا وہ بھی کیا کرتیں۔ سندیسہ کسی بات پہ کان نہ دھرتی۔ بی اے کے امتحان کے بعد سندیسہ فارغ ہوئی تو صغریٰ بی بی نے رشتہ دکھایا۔ دادی اماں کو یہ رشتہ پسند نہیں آیا تھا اور انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہمیں بہت پیسے والے اور شیخی بگھارنے والے لوگ نہیں چاہئیں۔ بیگم تنویر گو کہ دولت مند تھیں لیکن ان میں سنجیدگی نہ تھی بلکہ دنیاوی دکھاوا بہت تھا۔

”صغریٰ بی بی! سنو ہماری بچی کسی کی امانت ہے۔ اس امانت کو کسی حق دار تک پہنچانا ہے۔ لہٰذا اچھے لوگوں میں بات ٹھہراؤ۔“ دادی جان نے صغریٰ بی بی کو سمجھایا۔ ☆

آج اتوار کا دن ہے۔ گھر میں چہل پہل ہے۔ کچھ لوگ سندیسہ

کو دیکھنے آ رہے ہیں۔ نفیسہ بیگم نے دوپہر کے کھانے کا اہتمام کر رکھا ہے۔ شدیسہ نے بے دلی سے ایک اچھا سا سوٹ نکالا، بال سنوارے اور اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔

بیگم نادرہ خاتون، اپنی بیٹی کے ساتھ فضل حسین کے گھر پہنچیں تو ان کی شربت سے تواضع کی گئی۔ کچھ دیر بعد دوپہر کا کھانا لگا دیا گیا۔ سب لوگ دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ بیگم نادرہ کو کھانا شروع کرنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے بریانی اپنی پلیٹ میں نکالی اور ایک چمچ منہ میں ڈالا۔ ''اونہہ بہت مزے کی بریانی ہے۔ کس نے بنائی ہے؟''

''یہ..... یہ ہماری شدیسہ نے بنائی ہے۔'' نفیسہ بیگم نے جھٹ سے جواب دیا۔

محمد مرزوق نے سر اٹھایا، سب کے چہروں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''آنٹی! یہ بریانی امی جان نے بنائی ہے۔'' نفیسہ بیگم ایک دم بوکھلا گئیں اور آنکھیں چرانے لگیں۔ بیگم نادرہ جلد ہی صورت حال پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔ ''خیر ایک ہی بات ہے۔ ماں کے ہاتھ میں ذائقہ ہے تو شدیسہ کے ہاتھ میں بھی ایسا ذائقہ ضرور ہوگا۔''

نفیسہ بیگم نے سکھ کا سانس لیا۔ اب سب مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ بیگم نادرہ نے شدیسہ سے چھوٹی خدامہ کو پیار کیا اور رخصت کی اجازت مانگی۔

بہت دن گزر گئے لیکن ان کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہ آیا۔ ☆

''محمد مرزوق تم نے کیا کیا؟ شرم کرو، تمہاری بہن کی بات بننے جا رہی تھی، تم نے اچھا نہیں کیا۔'' نفیسہ بیگم مرزوق سے خفا تھیں۔

''امی جان! فکر مت کریں۔ آپی کی زندگی کی بنیاد جھوٹ پر مت رکھیں۔ یہ آپی کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ یقین کریں آپ کی نظر میں جو برا ہوا، وہ ایک اچھے کام کے لیے ہوا ہے۔''

شدیسہ بھی رد کیے جانے پر بہت افسردہ تھی۔ اسے احساس ہونے لگا کہ ایک بیٹی کے کیا فرائض ہیں۔ اس کی شخصیت ادھوری تھی۔ اس نے اپنی شخصیت کے خلا کو پُر کیا۔ کھانا پکانے اور گھر داری میں دلچسپی لینے لگی لیکن اس کا دل پژمردہ تھا۔ ایک بے نام سی اداسی اس میں گھر کر گئی تھی۔

''ہماری پیاری بہنیا، بنے گی دلہنیا۔'' مرزوق اس کے سر پر چپت لگا کر اسے چھیڑتا تو وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیتی۔ وہ مرزوق سے خفا تھی۔ اس نے سچ بول کر اسے شرمندہ کر دیا تھا۔

دادی جان کو بیگم نادرہ بہت پسند آئی تھیں۔ رمضان کی آمد آمد تھی۔ سب رمضان کی تیاریوں میں مگن تھے۔ آخر چاند رات آ گئی۔ رنگ برنگے، خوب صورت لباس، چوڑیاں اور مہندی۔ گھر میں خوب رونق تھی۔ نفیسہ بیگم نے گھر کو بہت سجا رکھا تھا۔

اچانک صغریٰ بی بی نے اطلاع دی کہ بیگم نادرہ ان کے ہاں آ رہی ہیں۔ سب بہت حیران تھے کہ یوں اچانک ان کا آنا.....؟ خیر ان کے لیے چائے کا انتظام کیا گیا۔ باہر ''چاند نظر آ گیا'' کا شور مچا۔ سب ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔ شدیسہ اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی تھی۔ اچانک دھڑ سے دروازہ کھلا۔ بیگم نادرہ اور ان کی بیٹی اندر داخل ہوئیں۔ ساتھ ہی گھر کے تمام افراد بھی اندر آ گئے۔ شدیسہ نے جلدی سے سر پر دوپٹہ اوڑھا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ بیگم نادرہ نے پرس میں سے ایک چمکتی دمکتی انگوٹھی نکالی اور شدیسہ سے چھوٹی خدامہ کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ شدیسہ اور سب گھر والوں کو ایک دھچکا سا لگا۔ یعنی بیگم نادرہ نے خدامہ کو پسند کر لیا تھا۔ بیگم نادرہ نے خدامہ کے کان میں کچھ کہا۔ ''کیسی لگی انگوٹھی؟'' ''بہت پیاری، آنٹی جان!'' ''اچھا ایسا کرو، تم یہ انگوٹھی شدیسہ کو دکھاؤ۔'' سب ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

بیگم نادرہ نے سب کو ایک خوش گوار حیرت سے دوچار کیا تھا۔ ''بیگم فاطمہ! شدیسہ کو تو میں نے پہلے ہی دن سے پسند کر لیا تھا۔ میں جان گئی تھی کہ آپ لوگوں کی بیٹی بہت قابل اور نیک ہے۔ اگر کمی تھی تو گھر داری سے ناواقفیت کی۔ میں ایک اچھی روایت کا آغاز کروں گی۔ لڑکی کو ایک خامی کی وجہ سے ٹھکرا دینے سے بہتر ہے کہ اس کی شخصیت کو بہتر بنا دیا جائے۔ میں مرزوق کی صاف گوئی پر بہت خوش ہوں، اس کے ایک سچ نے ہمیں ایک سگھڑ بہو سے نواز دیا ہے۔ ہیرا کان میں کوئلہ ہی تو ہوتا ہے۔ تراش خراش سے ہی اس میں چمک آتی ہے۔ ہماری شدیسہ بھی ہیرا ہے۔ میں ایسی ہی بہو چاہتی ہوں جو تعلیم یافتہ، دین دار اور سگھڑ ہو تا کہ میری اگلی نسلیں سنور جائیں۔ ہم اولاد کی تربیت کے بارے میں خدا کے جواب دہ ہیں۔'' بیگم نادرہ نے شدیسہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''میری پیاری بہنیا، بنے گی دلہنیا۔'' مرزوق نے شدیسہ کو چھیڑا۔ شدیسہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اس کا دل خوشیوں سے بھر گیا تھا۔ یہ عید اس کے لیے دوہری خوشیاں لائی تھی۔ وہ مرزوق کی شکر گزار تھی۔ انگوٹھی کی چمک دمک اس کے چہرے پر عید کی خوشیوں کو دوبالا کر رہی تھی۔

اس رات شدید بارش ہوئی اور جب بھی ایسی بارش ہوتی تو گلی کے کچا ہونے کی وجہ سے پانی ٹھہر جاتا۔ کوئی بھی بغیر پھسلے نہ رہتا اور اندھیرے میں چلنا تو تقریباً ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس رات بھی ایسی ہی شدید طوفانی بارش ہوئی تھی۔ رات کو میں نماز کے بعد فوراً سو گیا۔ رات گئے تک بارش ہوتی رہی۔ فجر کی اذان پر آنکھ تو کھل گئی مگر رات ہونے والی بارش کی وجہ سے طبیعت میں سستی چھائی ہوئی تھی۔ دل میں آیا کہ اتنی کیچڑ میں مسجد میں جانا تو مشکل ہے۔ جب نماز گھر ہی میں پڑھنی ہے تو کیوں نہ تھوڑی دیر اور سو لیا جائے، پھر ٹھہر کر پڑھ لوں گا۔ یہ سوچ کر میں نے کروٹ بدلی اور چادر تان کر سو گیا۔

"فرقان بیٹا! نماز کا وقت ہو گیا ہے، ابھی سوئے ہوئے ہو.....؟" چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ابو جان کی آواز کانوں سے ٹکرائی، اب تو اٹھنا ہی تھا۔ وضو کیا اور مسجد کی راہ لی۔ ابو جان پہلے ہی مسجد جا چکے تھے۔ نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد جیسے ہی گھر کی طرف چلا تو گلی کی نکڑ پر جہاں عام طور پر محلے والے اپنے گھروں کا کوڑا ڈال دیا کرتے تھے اور بعد میں ٹی ایم اے والے اٹھا کر لے جاتے تھے، اتنی صبح سویرے ایک بچے کو دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اس بچے کی عمر کوئی پانچ چھ سال ہوگی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا بڑا سا شاپر تھا اور وہ کوڑے کے ڈھیر پر جھکا ہوا تھا۔ پہلے تو دل میں آیا کہ چھوڑو...... ہو گا کوئی...... مگر پھر دماغ نے دل کے اس خیال کو رد کر دیا کہ اگر کوئی ردی اٹھانے والا ہے تو اتنی سویرے اس کو آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کسی انہونے خدشے کے پیشِ نظر میں ایک طرف ہو کر اس بچے کی حرکات و سکنات کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ بچہ اٹھا اور اس کا منہ میری طرف ہوا تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ میں نے جلدی سے آنکھوں کو مسلا کہ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا مگر یہ تو بالکل حقیقت تھی، ناقابلِ یقین حقیقت......!

اس بچے کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ ہمارے پچھلے محلے میں رہنے والے شوکت صاحب کا بیٹا تھا۔ وہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مال کی فراوانی کے باوجود وہ کافی سلجھے ہوئے انسان تھے مگر ان کے بیٹے کو اس حال میں دیکھ کر میں حیران و پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پہلے تو دل میں آیا کہ اس سے جا کر پوچھ لوں کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے مگر پھر اپنے اس ارادے کو عملی

جامہ پہنانے کی بجائے میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ دیکھتے ہیں کہ وہ کرتا کیا ہے۔ تھوڑی دیر تو وہ وہاں جھکا رہا، پھر سیدھا کھڑا ہوا اور شاپر اُٹھائے ہمارے گھر کی طرف آنے لگا۔ میں ایک اوٹ میں ہو گیا۔ اتنے میں وہ شاپر اُٹھائے، ہمارے گھر سے آگے گزر گیا۔ اس کے گزرتے ہی میں نے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ اس کی چال میں تیزی تو تھی مگر ایسے لگتا تھا کہ شاپر کافی وزنی ہے جس کے اُٹھانے میں اسے کافی دقت ہو رہی ہے۔ میں چپکے چپکے اس کے پیچھے چلتا رہا۔ تھوڑی دور جا کر گلی کا موڑ تھا اور میں بڑی احتیاط سے چل رہا تھا۔ ایک تو گلی پانی سے بھری ہوئی تھی اور دوسرا میری یہ کوشش تھی کہ اس بچے کو پتا نہ چلے کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ میری لاکھ احتیاط کے باوجود بھی گلی کا موڑ مڑتے ہی میرا پیر اچانک ایک گڑھے میں جا پڑا اور چھپاک کی آواز سے میرا پیر اس گڑھے میں اترتا چلا گیا۔ گڑھا لگتا تھا کافی گہرا تھا۔ بُرا تو یہ ہوا کہ وہ بچہ بھی اچانک اس آواز پر چونک کر مڑا اور مجھے دیکھ کر اس نے اپنے قدم اور تیز کر دیے۔ ''رُک جاؤ......!'' میری تیز آواز گونجی تو اس کے پیر وہیں رُک گئے، گویا زمین نے اس کے پیروں کو جکڑ لیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس گڑھے سے نکالا اور اس کے قریب جا کر سخت آواز میں پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو اور اس شاپر میں کیا ہے......؟

شاپر کا نام سنتے ہی اس نے شاپر کا منہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ گویا وہ شاپر مجھے نہیں دکھانا چاہتا تھا اور اس کی یہ حرکت مجھ سے چھپی نہ رہ سکی۔ ''شاپر مجھے دو!'' میرے کہنے پر ایک بار تو اس نے شاپر دوسرے ہاتھ میں کر لیا مگر جب اس نے دیکھا کہ میں ٹلنے والا نہیں ہوں تو اس نے شاپر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اس سے اس شاپر کو چھینا اور جب اس کو کھولا تو میرا غصہ دوچند ہو گیا۔ ایک تو مجھے اپنے گرنے کا غصہ تھا، اوپر سے شاپر میں موجود اخروٹوں اور دوسرے میوہ جات کے چھلکے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ گویا وہ بچہ ان چھلکوں سمیت میرا منہ چڑا رہے تھے۔ میں تو کوئی کارنامہ سرانجام دینے کا سوچ رہا تھا مگر یہ تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ میں نے اپنی خفت کو چھپانے کے لیے غصے پر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''یہ تم کہاں لے کر جا رہے تھے؟''

''وہ...... انکل...... میرے ابو نے کہا تھا کہ اس کو محلے کے باہر جو کوڑا کرکٹ کی جگہ ہے، وہاں ڈال کر آؤ......!''

''مگر تم اس کو اپنے محلے والے کوڑے دان میں بھی تو ڈال سکتے تھے، ٹی ایم اے والے اُٹھا لیتے...... تمہیں اتنی صبح سویرے وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی اتنے کیچڑ میں۔''

''انکل! دراصل بات یہ ہے کہ رات کو ابو ہمارے لیے اخروٹ اور چلغوزے لائے تھے۔ ان کو کھانے کے بعد ابو نے مجھے کہا کہ ان چھلکوں کو باہر نہ پھینکنا بلکہ کسی شاپر میں ڈال کر صبح سویرے نماز کے فوراً بعد محلے سے باہر والے کوڑے کے ڈھیر پر ڈال آنا، کیوں کہ یہ میوے کافی مہنگے ہیں۔ ہر ایک کے بس میں نہیں کہ ان کو خرید سکے۔ اب اگر ان کے چھلکے ادھر گلی میں ہی پھینک دیے تو کسی کی دل آزاری ہو سکتی ہے۔ دیکھنے والے کے دل میں یہ بات آ سکتی ہے کہ کاش! ہمارے پاس بھی اتنے پیسے ہوتے تو ہم بھی یہ میوے کھاتے یا کوئی بچہ دیکھے گا تو وہ اپنے ماں باپ کو جا کر تنگ کرے گا کہ ہمیں بھی لے کر دو۔ ہو سکتا ہے اس بچے کے ماں باپ کے پاس اتنی طاقت نہ ہو تو اس سے ان کا دل دکھے گا۔ یہ دل آزاری ہے اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے کسی کی دل آزاری کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔'' وہ بولتا جا رہا تھا اور میں حیرت کا بُت بنا اس کی باتوں کو سن رہا تھا۔ مجھے مکمل توجہ سے سنتا پا کر اس کو مزید کہنے کی جرأت ہوئی تو وہ کہنے لگا۔ ''انکل! راستے میں ایک جگہ اور مجھے چھلکے ملے تھے وہ بھی میں نے اس شاپر میں ڈال لیے ہیں تاکہ ان پر بھی کسی کی نظر نہ پڑے۔ ان کی وجہ سے بھی کوئی دکھی نہ ہو۔ انکل! جب ہم کسی کو دکھ نہیں دیں گے تو اللہ تعالیٰ اور ہمارے نبی ﷺ ہم سے خوش ہو جائیں گے نا......؟''

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا مگر میرا تو سر شرم سے جھکا جا رہا تھا کیوں کہ راستے میں سے اُٹھائے جانے والے جن چھلکوں کا وہ کہہ رہا تھا وہ وہی چھلکے تھے جو میں نے رات کو پھینکے تھے۔ اس کے عمل نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ میں نے کسی کا دل نہ دکھانے کا اور سنت پر عمل کرنے کا عزم مصمم کر لیا تھا۔

اسد اور احمر دو بھائی تھے۔ اسد کی عمر اٹھارہ سال تھی جب کہ احمر کی عمر آٹھ سال تھی۔ ان کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ والدہ تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گئیں جب کہ والد نے اسپتال جا کر دم توڑا۔ مرتے وقت ان کے والد نے اپنے بڑے بیٹے اسد کو احمر کے متعلق کچھ نصیحتیں اور وصیت بھی کی۔ باپ کے انتقال کے بعد اسد نے ایک ذمہ دار بڑے بھائی کا کردار ادا کیا۔ اس نے نہ صرف اپنے والد کا کاروبار یعنی جنرل اسٹور کو سنبھالا بلکہ احمر کی پرورش بھی احسن طریقے سے کی اور اس ذمہ داری کو اچھے طریقے سے نبھایا۔

احمر پڑھ لکھ کر آئی ٹی انجینئر بن گیا اور اسے ایک بہت اچھی نوکری مل گئی۔ اسد شادی کر چکا تھا۔ اس کی بیوی بھی احمر کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اسد کو جب نوکری مل گئی تو اسد اور اس کی بیوی نے باہمی مشورے سے احمر کی بھی شادی کرا دی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد احمر کی بیوی سہیلہ نے احمر سے کہا کہ وہ گھر میں اپنی پوزیشن کلیئر کرے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ گھر اور جنرل اسٹور میں احمر کا کتنا حصہ ہے اور بٹوارے کی صورت میں انہیں کتنی رقم مل سکتی ہے۔

احمر کو پہلی بار اپنی بیوی کی کوئی بات بُری لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے اسد بھائی سے الگ ہونا پڑے گا یا وہ ان سے اپنے حصے کی بابت دریافت کرے گا۔ وہ سہیلہ سے روٹھا رہا مگر سہیلہ ایک چالاک عورت تھی۔ اس نے احمر کو رام کر لیا اور سمجھایا کہ آخر سب کو بٹوارہ کرنا پڑتا ہے۔ اس پر بات چیت کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔

احمر کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بڑے بھائی سے بات کرے، وہ بہت دن تک الجھا الجھا سا رہا۔ سہیلہ کا تقاضا بڑھتا گیا۔ اسد نے محسوس کیا کہ احمر کسی الجھن کا شکار ہے۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔ احمر نے پہلے تو چھپانے اور ٹالنے کی کوشش کی مگر اسد نے اسے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ اسد نے اگلوا ہی لیا اور پھر وہ احمر کی پریشانی اور الجھن جان کر خود بھی پریشان ہو گیا۔ اس بارے میں تو اسد نے واقعی سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے سہیلہ کی خود غرض سوچ پر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا مگر وہ ایک سمجھ دار انسان تھا۔ اس نے حقیقت تسلیم کر لی اور احمر کو اتوار کا وقت دیا کہ وہ اس وقت تک تمام حساب کتاب کر کے اس کی خواہش پوری کر دے گا۔

احمر کو بھائی سے بات کرنے کے بعد دکھ سا محسوس ہوا۔ اسد نے اس کے مستقبل کی خاطر اپنی بہت ساری خوشیوں کو قربان کیا تھا۔ وہ ایک بہتر مستقبل حاصل کر چکا تھا اور یہ ابتداء تھی۔ اس کے برعکس اسد کی مالی حالت خراب تھی۔ اسٹور میں کچھ پارٹنر بھی تھے۔ آبائی مکان کافی خستہ ہو چکا تھا جس کو بہتر کرنے پر بہت خرچا آ رہا تھا اور شاید اسد یہ کر نہیں پا رہا تھا۔

احمر نے ہفتے کی رات اپنی گذشتہ زندگی کے بارے میں بہت سوچا۔ جب وہ صرف بارہ سال کا تھا تو اسد نے شادی کر لی مگر اپنی

اولاد ہو جانے کے بعد بھی اسد کا احمر سے پر شفقت رویہ تبدیل نہ ہوا۔ پہلی مرتبہ اس کی بہترین تعلیم کے لیے اسد نے اپنے اسٹور کے آدھے مالکانہ حقوق فروخت کیے، پھر اس کے بعد اس نے کیسے احمر کی مہنگی تعلیم کے لیے وسائل مہیا کیے، یہ صرف وہی جانتا تھا۔ ایک مرتبہ بھابی نے اسد کی توجہ بڑھتے ہوئے قرض کی طرف دلوائی تو اسد نے یہ جواب دیا تھا کہ احمر میرا خواب ہے، میرا سب کچھ احمر کا ہے۔

یہ بات احمر نے سنی تھی مگر اس وقت اس نے پرواہ نہ کی تھی لیکن اب اسے یہ بات یاد آئی تو وہ تڑپ کر رہ گیا۔

ایک کے بعد ایک نیکی...... قربانی...... اور ایثار بھرے واقعات نظروں کے سامنے گزرنے لگے۔ اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔ وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند تو جیسے اس سے روٹھ گئی تھی اور پھر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا اور جب سحر نمودار ہو رہی تھی اور لوگ بیدار ہو رہے تھے تو اس کی آنکھ لگ گئی۔

اتوار کا دن آ گیا۔ احمر، سہیلہ کو لے کر اپنے بھائی کے گھر پہنچا تو سب کچھ بہت خوش گوار تھا حالانکہ وہ توقع کر رہا تھا کہ کچھ تناؤ اور ناراضی کی کیفیت ہو گی مگر بھابی تک کا رویہ نارمل تھا۔ اسد کے بچوں نے پہلے کی طرح احمر کو سلام کیا اور اس سے لپٹ گئے۔ بھابی نے ہمیشہ کی طرح آج بھی شان دار کھانا تیار کیا تھا، لگ ہی نہیں رہا تھا کہ آج کوئی ناپسندیدہ فیصلہ ہونے جا رہا ہے۔ کھانے کے بعد اسد ایک فائل لے کر آیا۔ فائل میز پر رکھ کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ احمر نے دیکھا کہ وہ تھکا تھکا اور پژمردہ لگ رہا ہے۔ حالات کے جبر نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ اسد نے بغیر کسی تمہید کے فائل کھولی اور آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''جب امی ابو کا انتقال ہوا تو اسٹور پر پانچ لاکھ کا قرضہ تھا۔ اس مکان کی قیمت اس وقت چار لاکھ تھی۔ اسٹور کی مالیت قرض سمیت پانچ لاکھ تھی۔ اس طرح تمہاری وراثت چار لاکھ روپے تک محدود تھی۔ ابو جی نے وصیت کی تھی کہ مکان میں لے لوں اور دو لاکھ روپے احمر کی تعلیم و تربیت پر خرچ کروں۔'' اسد سانس لینے کے لیے رُکا تو سہیلہ نے معنی خیز نظروں سے احمر کی طرف دیکھا۔ اسے یہ ساری باتیں جھوٹ اور جائیداد ہتھیانے کا ڈراما لگ رہی تھیں۔

اسد ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ ''میں نے اس وقت ابو جی کے فیصلے کو قبول کر لیا کیوں کہ بحث و مباحثے کا وقت نہ تھا۔ مجھے یہ فیصلہ قبول نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے احمر سے پیار تھا۔ یہ بہت چھوٹی عمر میں ابو کے پیار سے محروم ہو گیا۔ یہ ایک مظلوم بچہ تھا۔''

اسد کی آواز بھرّا گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روکا اور پھر بولا۔ ''بھلا بھائیوں کے درمیان بھی لین دین یا سودے بازی ہوتی ہے۔ میں نے احمر کے لیے جو کچھ کیا، اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ اسٹور کے مالی معاملات آج بھی وہی ہیں کہ ہمارا حصہ دس لاکھ کا ہے اور اسٹور کا قرض بھی دس لاکھ کا ہے۔ البتہ یہ مکان آج چالیس لاکھ کا ہے۔ اصولاً مکان کو دو حصوں میں تقسیم ہونا چاہیے مگر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ مکان میں احمر کے نام کر دوں گا۔ اگلے چار پانچ سال تک علینہ اور اصغر اپنی تعلیم مکمل کر لیں گے۔ وہ اپنی زندگی خود بنا لیں گے۔ مجھے اپنے بچوں سے ویسی ہی امیدیں وابستہ ہیں جیسی احمر سے تھیں۔ امید ہے یہ بھی احمر کی طرح میری توقعات پر پورا اتریں گے۔''

اسد یہ کہہ کر چپ ہوا تو ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا۔ احمر نے عجیب سی نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے لالچ نے اسے عجیب موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ اسد یہ فیصلہ کرے گا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اسد نے فائل اٹھا کر احمر کو دی اور بولا۔ ''میں نے قانونی کاغذات تیار کروا لیے ہیں۔ اب یہ مکان احمر کا ہے۔''

سہیلہ کے لیے بھی یہ صورت حال غیر متوقع تھی مگر اسے یہ فیصلہ قبول تھا اور پسند بھی آیا تھا۔ وہ ایک لالچی عورت تھی۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

احمر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اسد کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا کر بولا۔ ''بھائی! مجھے معاف کر دیں۔ مجھے بٹوارہ نہیں چاہیے۔ مجھے یہ مکان نہیں چاہیے۔ یہ مکان علینہ اور اصغر کے نام کر دیں۔ یہ بھی میرے بچوں کی طرح ہیں!''

اسد نے نظر بھر کر احمر کی طرف دیکھا، پھر فخریہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا مگر اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا۔ احمر، اسد کے گلے لگ گیا۔ چند لمحے کے آنسوؤں میں برسوں کا غبار نکل گیا۔

بٹوارہ معطل ہو گیا۔ بدگمانی اور لالچ کی ہار ہو گئی، محبت جیت گئی۔

معلوماتِ عامہ

- امریکہ نے ریاست الاسکا روس سے 72 لاکھ ڈالر میں خریدی تھی۔
- روم کے بادشاہ کمبوڈس نے ایک ہزار اکتیس جنگیں لڑیں اور تمام میں کامیابی حاصل کی۔
- تاجکستان کی 1400 کلومیٹر سرحد افغانستان سے ملتی ہے۔
- موسیقی کا آلہ سیکسو اوڈولف سیکس نے ایجاد کیا۔
- تان سین کے استاد کا نام ہری داس تھا۔
- سابق ہیوی ویٹ باکسنگ چیمپئن مائیک ٹائی سن نے 1993ء کو اسلام قبول کیا۔

(احسن آفاق، کراچی)

- اری ٹیریا میں 70 فی صد مسلمان ہیں۔
- اری ٹیریا کا صدر مقام اسمارا ہے۔
- ترک عثمانی سلطنت نے اری ٹیریا کو 1557ء میں اسلامی برادری میں شامل کیا۔
- اری ٹیریا کی مادری زبان عربی ہے۔
- اری ٹیریا پر 328 سال تک اسلامی پرچم لہراتا رہا۔
- برطانیہ نے اری ٹیریا پر 1941ء میں قبضہ کیا۔
- اری ٹیریا کا رقبہ 47876 مربع میل ہے۔
- اری ٹیریا مئی 1993ء میں آزاد ہوا۔

(گلشن نوید، لاہور)

- دیوار چین کے بعد دنیا کی دوسری طویل ترین دیوار، دیوار ہیڈرین ہے جس کی لمبائی 74.5 میل ہے۔
- پھلوں اور بیجوں کی ساخت کو کارپولوجی کہتے ہیں۔
- ہمالیہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں برف کا گھر۔
- کمبوڈیا دنیا کا واحد ملک ہے جہاں انسانی ڈھانچوں کی تجارت وسیع پیمانے پر ہوتی ہے۔
- مصنوعی بالوں کا فیشن یورپ میں اٹھارویں صدی میں شروع ہوا۔
- فاسفورس والی ماچس فرانس میں ایجاد ہوئی تھی۔
- ایک پونڈ میں 454 گرام ہوتے ہیں۔
- بدھ مت کا مذہبی رنگ پیلا ہے۔

- دنیا کی سب سے بڑی گھنٹی ماسکو (روس) میں ہے۔
- دنیا میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ملک سویڈن ہے۔
- ایشیاء میں میٹھے پانی کی سب سے بڑی جھیل وولر ہے جو مقبوضہ کشمیر میں دریائے جہلم کے کنارے سوپور اور بانڈی پور کے درمیان واقع ہے۔

(ام فروا، پھالیہ)

- دنیا کے بلند ترین میناروں والی مسجد کاسابلانکا میں ساحل سمندر پر واقع ہے۔
- دنیا میں بلند ترین میناروں والی مسجد کا افتتاح اگست 1993ء میں مراکش کے شاہ حسن ثانی نے کیا تھا۔
- دنیا میں بلند ترین میناروں والی مسجد سات سو فٹ کی بلندی تک ہے۔
- کاسابلانکا میں واقع دنیا کی بلند ترین میناروں والی مسجد کے ہال میں 25 ہزار اور صحن میں 80 ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے۔
- کاسابلانکا میں واقع دنیا کی بلند ترین میناروں والی مسجد کو نمازیوں کے لیے 4 فروری 1994ء کو کھولا گیا تھا۔

(حنا مشتاق، گجرات)

- برطانیہ کے اخبار ''سن اور سٹار'' نے سعودی عرب کے بادشاہ شاہ فہد کو ''دل کا بادشاہ'' کا خطاب دیا کیوں کہ سال 1995ء میں شاہ فہد نے ایک چار سالہ بچی کے علاج کے لیے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈ یعنی تقریباً ستر لاکھ روپے عطیہ دیے تھے۔
- سعودی عرب کا قومی دن 23 ستمبر کو ہوتا ہے۔
- دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا پہلا ''جوتوں کا میوزیم'' کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں قائم کیا گیا ہے۔
- کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں قائم ''جوتوں کا میوزیم'' چھ مئی 1995ء کو عوام کے لیے باقاعدہ طور پر کھول دیا گیا تھا۔
- پاکستان میں پہلی مرتبہ اگست 1995ء میں جلو سفاری پارک لاہور میں شتر مرغ کے چار انڈوں سے بچے پیدا ہوئے تھے۔
- دنیا میں سب سے زیادہ تیل نکالنے والے چشمے اسلامی ملک کویت میں ہیں۔

(شہلا رضا، لاہور)

اَلرَّءُ وُ فُ جَلَّ جَلَالُہٗ (بہت نرمی کرنے والا)

اَلرُّؤف جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جو اپنے بندوں پر آسانی اور مہربانی کا معاملہ کرنے والا ہے۔

یہ مبارک نام قرآن کریم میں دس مرتبہ آیا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ آپ بھی پڑھیں۔

''اللہ تعالیٰ تم پر نرمی کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔''

اس اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور ساری مخلوق کے ساتھ بڑی آسانی اور مہربانی والا معاملہ کیا ہے، جس کی ایک مثال یہ ہے کہ جتنی مخلوق ہے تو اس کے ماحول کے اعتبار سے ویسی ہی کھال بنائی تاکہ وہ سردی گرمی سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔

یہ اسی کی مہربانی ہے کہ رات کو دن میں تبدیل کیا۔ اگر ہمیشہ رات ہی رہے تو دن میں کام کاج کیسے کرتے؟ ہم کیسے پڑھتے اور کیسے لکھتے؟

یہ جتنے جانور ہیں یہ انسانوں کے کیسے قابو میں ہیں جس سے وہ ان جانوروں سے کام لیتے ہیں۔ یہ بھی اسی کی مہربانی ہے۔ اس طرح جہاں بیماری پیدا کی، وہاں اس کی دوا بھی پیدا کی ہے۔

آدھا انچ

عتیق، سلمان اور بہزاد تینوں آج شہر سے دریا کے کنارے کے دوسری طرف جنگل میں فاختاؤں اور پرندوں کا شکار کرنے کے لیے نکلے ہوئے تھے، تینوں کے پاس ائرگن تھی۔

ساڑھے تین گھنٹے میں اب تک وہ تیرہ فاختائیں اور پانچ جنگلی کبوتروں کا شکار کر چکے تھے۔ وہ سارے ذبح کر کے انہوں نے ایک پلاسٹک کے تھیلے میں رکھے ہوئے تھے۔

''عتیق! میرا خیال ہے اب بس کریں۔'' سلمان نے کہا۔

''ہاں دوست! تھک گئے ہیں، ادھر ہی بیٹھ کر کھانا کھا لیتے ہیں۔'' بہزاد نے بھی کہا۔

تینوں دوست ایک گھنے درخت کے نیچے کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ تینوں نے اپنے اپنے گھر کا کھانا اور پانی کی بھری بوتلیں دسترخوان پر رکھیں اور کھانے لگے۔

عتیق اپنے گھر سے جو سالن لایا تھا وہ مکس سبزیاں تھیں۔ بہت ساری سبزیاں اکٹھی بنائی گئی تھیں اور اس میں مرغی کا گوشت بھی تھا۔

"اف، اوہو یار.....! یہ سبزیاں مجھے بالکل پسند نہیں، امی نے آج ہی سبزیاں بنائی تھیں۔" عتیق نے سالن میں نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس میں مرغی کا گوشت بھی تو ہے۔" بہزاد نے وضاحت کی۔

"لیکن سبزیاں تو مجھے پسند نہیں ہیں۔"

"اور مجھے گوشت اچھا نہیں لگتا۔ دیکھو، میرا سالن بھی گوشت ہے۔" سلمان نے کہا۔

"ارے بھائی! کھانے میں کوئی عیب نہیں نکالنا چاہیے۔ پسند ہو تو کھا لو ورنہ رہنے ہی دینا چاہیے۔" بہزاد نے ان دونوں کو نرمی سے کہا اور اپنے گھر سے لائی ہوئی بریانی ان دونوں کے سامنے سرکا دی اور دونوں کے گھر سے آئے ہوئے سالن کے ساتھ روٹی کھانے لگا۔

"یہ انسان بڑے ناشکرے ہیں۔" ان تینوں کو ایک آواز سنائی دی۔

"اللہ تعالیٰ نے اس انسان پر کتنی نرمی اور مہربانیاں فرمائی ہیں۔" انہوں نے ذرا توجہ سے دیکھا تو اس درخت کی چوٹی پر ایک سفید اور سیاہ کبوتر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

سفید کبوتر نے کہا۔ "یہ اسی انسان کی خصوصیت ہے کہ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھاتے ہیں جب کہ دوسرے پرندے اور جانور اپنے منہ سے کھاتے ہیں۔"

"یہ مہربانی بھی تو ہے۔ یہ لوگ بول کر، خط لکھ کر یا اشاروں سے اپنے جذبات دوسروں کو بتا دیتے ہیں۔ پہلے زمانے میں یہ لوگ ہم کبوتروں ہی کے ذریعے اپنے خطوط اور پیغام ایک علاقے سے دوسرے علاقوں تک پہنچاتے تھے۔" سیاہ کبوتر نے کہا۔

"یہ تینوں لڑکے کھانا کھا رہے ہیں، ہم پرندے اور جانور صرف ایک چیز ہی کھاتے ہیں۔ گوشت یا صرف گھاس یا صرف دانہ دنکا جب کہ یہ لوگ گوشت کے ساتھ سبزیاں ملا لیتے ہیں۔ کئی دالیں اکٹھی پکا لیتے ہیں، دودھ میں آم ملا لیتے ہیں۔ برف میں کئی طرح کی بوتلیں ڈال لیتے ہیں، کئی طرح کے مصالحے ایک ہی سالن میں ڈال لیتے ہیں۔" سفید کبوتر نے انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

تینوں دوست کھانا کھاتے حیرت سے یہ ساری باتیں سنے جا رہے ہیں۔

"یہ دیکھو ان تینوں نے ہمارے کتنے دوستوں کا شکار کیا اور انہیں ذبح کر کے اپنے تھیلے میں ڈال لیا ہے۔" سیاہ کبوتر نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے ان پر کتنی مہربانی کی ہے۔ بیمار ہوتے ہیں تو ان کے لیے دوا بھی پیدا کی ہے۔ یہ علاج معالجہ بھی کرتے ہیں جب کہ جانور ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔ پھر بھی یہ لوگ بہت ناشکرے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے۔"

پیارے بچو! دونوں کبوتروں کی گفتگو میں عتیق، سلمان اور بہزاد سمیت ہم سب کے لیے بڑی عبرت ہے۔

اس لیے آج ہی سے ہم مہربانیاں کرنے والے رب کی نعمتوں کی قدر کر لیں۔

اپنے دشمن سے بچاؤ

عزیز ساتھیو! یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی کی انتہا ہے کہ شیطان جیسے بڑے اور خطرناک دشمن سے بچاؤ کا بڑا آسان اور بہترین طریقہ بھی بتا دیا۔

وہ یہ کہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے وقت اور بیت الخلاء میں جانے سے پہلے یہ پڑھ لیا کریں:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم

ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں، شیطان مردود سے۔

دیکھا! آپ لوگوں کے لیے کس قدر آسان نسخہ ہے بڑے دشمن سے بچنے کے لیے۔ ہو سکے تو یہ بھی یاد کر لیں، اسے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ ھَمْزِہٖ وَنَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ

ترجمہ: میں بے حد سننے والے، خوب جاننے والے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں شیطان مردود سے، اس کے چوکوں سے، اس کے پھونکنے سے اور اس کے دم کرنے سے۔

☆.....☆.....☆

ایک بہت خوب صورت، سرسبز وادی تھی اور اسی وادی میں ایک بہت اونچا، آسمان کو چھوتا ہوا پہاڑ تھا۔ اسی پہاڑ کی چوٹی پہ ایک تین کونوں والا بہت پرانا گھر بنا ہوا تھا۔ باہر سے وہ گھر مثلث کی طرح نظر آتا تھا جس کی چمنی سے ہلکا ہلکا دھواں نکلتا رہتا تھا۔

اس گھر تک آنے کے لیے ایک پہاڑی راستہ بھی موجود تھا جو کافی ٹیڑھا ہونے کے ساتھ ساتھ اونچا نیچا بھی تھا اور اس گھر میں رہنے والے مکین کا نام جس سے لوگ اسے جانتے اور پکارتے تھے ''مسٹر ابو'' تھا! اس کا اصلی نام کیا تھا اور مختصر ہو کر ''ابو'' کیسے بن گیا تھا، اس کے بارے میں ٹھیک سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کسی کو دلچسپی تھی۔ ان کے لیے وہ ''مسٹر ابو'' ہی تھے۔

مسٹر ابو کی عمر لگ بھگ 100 سال کے قریب تھی اور ان کا مخصوص لباس آسمانی یا پھر سرمئی رنگ کا پاؤں تک آتا گاؤن تھا۔ سر پہ اسی رنگ کی مخروطی ٹوپی اور آنکھوں پہ نازک سی سنہری فریم کی عینک، جس کی چین گلے میں لٹکی ہوئی ہوتی تھی اور پیٹ تک آتی۔ ان کی سفید داڑھی بہت بھلی لگتی تھی۔ مسٹر ابو بہت مہربان اور شفیق انسان تھے جن کا کام چوبیس گھنٹے بس لکھنے کا ہی ہوتا تھا۔

مسٹر ابو اپنے گھر کے کمرے میں لکڑی کی بنی کرسی پہ بیٹھے، کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ ان کے اردگرد بہت سی شیلف اور الماریاں تھیں جن میں کتابیں ہی کتابیں تھیں جو ایک ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ مختلف شیلف میں، مختلف قسم اور رنگوں کے کاغذ بھی ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ مسٹر ابو کے پاس بہت خوب صورت سا سنہری پَر تھا جس سے وہ لکھتے تھے۔ ویسے تو ان کے پاس تحفے میں ملے ہوئے کئی قلم تھے مگر وہ ذاتی طور پہ اسی سنہری پَر سے لکھنا پسند کرتے تھے۔ مسٹر ابو یہ کام کئی سالوں سے، بنا تھکے، بنا رکے کر رہے تھے۔ انہیں اپنے کام سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ اگر کبھی تھک بھی جاتے تو کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ دیر کے لیے سو جاتے۔

مسٹر ابو کے پاس دنیا جہاں سے بچے آتے تھے اور ان کو مخاطب کر کے اپنے پسند کے کاغذ پہ، اپنی ڈھیر ساری خواہشات یا خواب لکھواتے تھے جنہیں مسٹر ابو بہت شوق اور دلجمعی سے لکھتے اور اپنے گھر کے باہر پرانے سے لیٹر باکس میں ڈال دیتے تھے۔ مسٹر ابو کا یقین اور اعتقاد تھا کہ آسمان سے فرشتے اترتے ہیں اور بچوں کی

سب خواہشات اور خوابوں کو اکٹھا کر کے لے جاتے ہیں۔

مسٹر ابو کے گھر تک پہنچتے پہنچتے، بچے ہانپ کر رہ جاتے تھے کیوں کہ مسٹر ابو کا گھر بہت اونچائی پہ تھا۔ اپنے گھر آنے والوں کو مسٹر ابو بہت خوش دلی سے خوش آمدید کہتے تھے۔ ان کے گھر کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا، سوائے برسات کے دنوں میں۔ مسٹر ابو کو بارش سے بہت چڑ تھی اور وہ اپنے گھر آنے والے سب بچوں کو سختی سے پانی یا ایسی کوئی بھی چیز لانے سے منع کرتے تھے کیوں کہ ان کو ڈر تھا کہ کہیں پانی سے ان کی کتابیں یا کاغذ خراب نہ ہو جائیں۔

''مسٹر ابو! کیسے ہیں آپ؟'' گلابی رنگ کی خوب صورت سی فراک میں ملبوس، ہاتھ میں پھولوں کی چھوٹی سی ٹوکری پکڑے، بلاشبہ وہ بچی بہت خوب صورت تھی، جس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مسٹر ابو اس نیلی آنکھوں والی بچی کو بہت اچھی طرح سے جانتے تھے جو اکثر و بیشتر ان کے پاس اپنی کوئی نہ کوئی خواہش یا خواب لے کر آتی تھی۔ بہت نخریلی سی لڑکی تھی۔ اسے کوئی کاغذ اتنی جلدی پسند نہیں آتا تھا۔ وہ کافی دیر تک مسٹر ابو کو ستاتی تھی، پھر جا کر مطمئن ہوتی تھی۔

''مس کیتھرین! آج آپ کافی دنوں کے بعد آئی ہیں۔ بتایئے کون سا کاغذ پسند کریں گی آپ اپنی خواہش کے لیے۔'' مسٹر ابو نے مسکراتے ہوئے دس سال کی اس بچی کو دیکھا جو بہت نزاکت کے ساتھ اپنی فراک سنبھالے سامنے رکھی کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔ پھولوں کی ٹوکری اس نے میز پہ رکھ دی تھی۔ اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھوں سے مسٹر ابو کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''اوہو مسٹر ابو! کتنی بار کہا ہے کہ مجھے کیتھرین نہیں، کیٹ کہا کریں۔''

کیتھرین نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا تو اپنی عینک کے پیچھے سے جھانکتے مسٹر ابو مسکرا دیے اور میز پہ رکھا موم بتیوں کا شیشے کا مرتبان اس کو پیش کرتے ہوئے بولے۔

''اوکے مس کیٹ...... کیا آپ اپنے لیے کاغذ خود پسند کریں گی یا میں کروں؟''

''مسٹر ابو! آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ مجھے گلابی رنگ پسند ہے، اور میں ہر بار گلابی رنگ کے کاغذ پہ ہی اپنی خواہش لکھواتی ہوں۔ پتا نہیں آپ بھول کیوں جاتے ہیں۔'' ننھی کیٹ نے منہ بناتے ہوئے کہا اور شیشے کے مرتبان میں سے، نفاست سے کینڈی نکال کر کھانے لگی۔

''اوکے مس کیٹ! جیسا آپ پسند کریں۔'' مسٹر ابو نے کہا اور اٹھ کر گلابی رنگ کے نفیس سے سادہ کاغذ نکال کر لے آئے۔ اس دوران کیٹ انہیں دیکھتی رہی۔

''جی بولیے مس کیٹ کیا لکھوں؟'' مسٹر ابو نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔ کیٹ نے بہت انداز سے، اپنے سنہری بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اپنی خواہشات لکھواتی گئی جسے سن کر مسٹر ابو مسکرا دیے اور سنہرے پَر سے کاغذ پر منتقل کرتے گئے۔

''مس کیٹ! آپ کی خواہشات کافی بڑی بڑی ہوتی ہیں۔'' مسٹر ابو نے جب کیٹ کی بتائی ساری خواہشات لکھ لیں تو مسکرا کر بولے۔ کیتھرین عرف کیٹ کے والد بہت امیر اور امریکا کے مشہور بزنس مین تھے۔ سو اس کی خواہشات بھی اسی طرح کی ہوتی تھیں۔ مہنگی مہنگی چیزوں کے نام اسے ازبر تھے جو شاید عام بچوں کو پتا بھی نہ ہوں۔ اس کی خواہشات اور خواب کافی مہنگے اور اونچے ہوتے تھے۔

''اوکے مسٹر ابو! میں چلتی ہوں۔'' ننھی کیٹ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے نزاکت سے کہا اور اپنی پھولوں کی ٹوکری اٹھا کر باہر کو نکل گئی۔ اس کے بعد مختلف رنگ، مختلف نسل کے چھوٹی بڑی عمر کے بچے ان کے پاس آتے رہتے اور اپنی پسند کے کاغذ پہ، اپنی خواہشات لکھواتے گئے۔ یہ بچے دنیا کے مختلف ملکوں سے آتے تھے اور ان کی وجہ سے مسٹر ابو کو بھی دنیا کے بہت سے ممالک کا پتا چل چکا تھا کیوں کہ یہ بچے اپنے ملک کی تہذیب، ثقافت اور روایات کے آئینہ دار ہوتے تھے اور ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور خواہشوں سے مسٹر ابو، ان کے بارے میں بہت کچھ جان جاتے تھے۔

اس دن صبح سے آسمان پہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ مسٹر ابو کو خدشہ تھا کہ کہیں بارش نہ ہو جائے۔ وہ بارش کی آواز سے بھی چڑتے تھے، دیکھنا تو دور کی بات تھی۔

آج صبح سے کوئی بچہ ان کے پاس نہیں آیا تھا۔ شاید خراب موسم کی وجہ سے! مسٹر ابو، پھر بھی سفید اور سادہ کاغذوں پہ کچھ نہ کچھ لکھ

رہے تھے کہ لکھنا ان کی عادت اور ہاتھوں کی مجبوری تھی۔

اس وقت ان کے دروازے پہ کھٹکا ہوا تو انہوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں دو بہت کمزور اور مفلوک الحال بچے ڈرے سہمے اندر جھانک رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں موجود پانی کی بوتل دیکھ کر مسٹر ابو غصے سے بولے۔

''اس بوتل کو پھینک دو۔ بدتمیز بچو! کیا تمہیں پتا نہیں کہ یہاں اس طرح کی کوئی بھی چیز لانا منع ہے۔''

دونوں بچے جو پہلے ہی بہت خوف زدہ اور ڈرے ہوئے تھے، فوراً انہوں نے بوتل پھینک دی اور مسٹر ابو کی طرف دیکھنے لگے جواب بھی خفگی سے انہیں گھور رہے تھے۔

''اب آ بھی جاؤ اندر......!'' مسٹر ابو نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو دونوں بچے ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ چلتے اندر آ گئے۔ ان کا حلیہ کافی خراب اور بُرا تھا اور وہ بہت کمزور اور زرد رنگ رہے تھے۔ مسٹر ابو نے اتنے بُرے حال میں کبھی کوئی بچہ نہیں دیکھا تھا۔ مسٹر ابو نے ان دونوں کا بغور جائزہ لیا۔ ایک بچہ پانچ سال اور دوسرا تقریباً سات سال کے قریب تھا۔ ان کی سانسیں بُری طرح پھولی ہوئی تھیں اور چہرے پہ شدید مشقت اٹھانے کے تاثرات تھے۔

''ہاں اب بتاؤ! کون سا کاغذ پسند کریں گے آپ دونوں۔''

مسٹر ابو نے سامنے لگے مختلف رنگوں کے کاغذوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ک......ک، کوئی سا بھی!''

سات سال کے بچے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پہ خشکی جمی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری اور اپنے ساتھ کھڑے ڈرے سہمے بچے کا ہاتھ دبا کر تسلی دی۔ مسٹر ابو نے غور سے ان کے ابتر حلیے کو دیکھا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان عجیب و غریب بچوں کے لیے کون سا کاغذ منتخب کریں۔ آخر انہوں نے تنگ آ کر ایک سفید رنگ کا سادہ کاغذ نکال لیا۔ اسی وقت بادل زور سے گرجے اور بارش کی آواز آنے لگی۔ مسٹر ابو نے ناگواری سے ناک چڑھائی۔

''پھر وہی بارش......'' مسٹر ابو نے خود کلامی کی۔

''بارش! سچ میں بارش ہو رہی ہے!'' پانچ سال کے ڈرے سہمے بچے کے کمزور اور زرد پڑے چہرے پہ یکبار جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی اور اس نے اپنے ساتھ کھڑے دوسرے بچے کا ہاتھ پکڑ کر زور سے کھینچتے ہوئے خوشی سے پوچھا تھا تو اس نے بھی خوشی اور مسرت سے سر ہلا دیا۔

مسٹر ابو کی ناگواری مزید بڑھ گئی اور انہیں بلاوجہ ہی یہ بچے بُرے لگنے لگے تھے۔ ''آپ جلدی سے ہماری خواہش لکھ دیں۔'' اسی سات سال کے بچے نے مسٹر ابو کی طرف متوجہ ہو کر کہا تو مسٹر ابو تپ گئے۔

''تم کچھ بولو گے تو میں لکھوں گا ناں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ آئے کہاں سے ہو؟'' مسٹر ابو نے ہاتھ میں پَر پکڑتے ہوئے سوال کیا۔

''ہم...... یہاں سے بہت دور آباد ایک ملک پاکستان سے آئے ہیں، مگر آپ جلدی کریں ہم بہت مشکل سے یہاں تک پہنچے ہیں۔''
اس بچے نے پیچھے دروازے کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہاں کوئی اس کا منتظر ہو۔

''یہ کون سا ملک ہے؟'' مسٹر ابو نے چونک کر ان سے پوچھا اور پھر اپنی میز پہ رکھے بڑے سے گلوب میں ملک پاکستان دیکھنے لگے۔ یہ گلوب شیشے کا بنا تھا جس میں اس ملک کے نام پہ انگلی رکھیں تو ایک سکرین روشن ہو جاتی تھی اور اس میں اس ملک کی فلم یا سلائیڈ چلنے لگتی تھی جس میں اہم معلومات ہوتی تھیں۔ مسٹر ابو نے کچھ دیر غور سے ملک پاکستان کے متعلق چلتی ہوئی سلائیڈ دیکھیں اور پھر بولے۔

''اچھا! تو تم لوگ اس تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملک سے تعلق رکھتے ہو۔ خیر بتاؤ! یہاں کیوں اور کس لیے آئے ہو؟''

مسٹر ابو نے دوبارہ بچوں کی طرف متوجہ ہو کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''انکل ہم بہت مشکل میں ہیں اور اسی وجہ سے ہم سب بچوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم پوری دنیا میں سب کے پاس جائیں گے اور سوئے ہوئے لوگوں کو جگائیں گے، اپنی حالت زار بتائیں گے۔ آپ جلدی سے ہماری خواہش لکھ لیں، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

اسی سات سال کے بچے نے بے چینی سے اپنے ساتھ کھڑے بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ مسٹر ابو نے اس کی بات پہ چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں بتاؤ! کیا خواہش ہے تمہاری؟''

''ہمیں ڈھیر سارا پانی چاہیے! جیسی بارش آپ کے یہاں ہو رہی ہے، ایسی بارش چاہیے!'' بچے نے جلدی سے اپنی خواہش بتاتے ہوئے کہا تو مسٹر ابو چونک گئے۔ ''یہ کیسی عجیب و غریب خواہش ہے۔''

''آپ جلدی سے لکھ دیں۔ ہم نے اللہ سے بہت دعائیں بھی کی ہیں اور دعا کے ساتھ ساتھ عملی قدم بھی اٹھا رہے ہیں تاکہ ہم سوئے ہوئے لوگوں کو جگا سکیں جنہوں نے ہماری طرف سے آنکھیں بند کر لی ہوئی ہیں۔'' بچے نے جلدی سے کہا تو مسٹر ابو حیران نظروں سے انہیں دیکھتے رہ گئے۔ اسی وقت ساتھ کھڑا ہوا پانچ سال کا بچہ نیچے گر گیا تو مسٹر ابو جلدی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھے۔

''کیا ہوا؟'' مسٹر ابو نے اس بچے کو ہلاتے ہوئے سات سال کے دوسرے بچے سے پوچھا جو خود بھی گھبرا گیا تھا اور تھک ہار کر زمین پہ بیٹھ گیا۔

''میں آپ سے کہہ بھی رہا تھا کہ جلدی کریں مگر آپ بھی دوسرے لوگوں کی طرح سوچ بچار میں وقت لگا دیتے ہیں۔'' اس بچے نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو مسٹر ابو چونک کر اس کی بگڑی حالت دیکھنے لگے۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا تم دونوں کسی بیماری کا شکار ہو!'' مسٹر ابو نے پریشان لہجے میں پوچھا تو اس بچے کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

''میں اور میری طرح کے بہت سے بچے، تھر کے ریگستان میں غذائی قلت اور پیاس سے مر رہے ہیں! اس سال وہاں بارشیں نہیں ہوئیں اور اسی لیے پانی کا ذخیرہ نہ ہونے کی وجہ سے چرند پرند سمیت ہر چیز ختم ہو رہی ہے۔ میرے ساتھ اور بھی بچے آئے ہیں مگر وہ کمزوری کی وجہ سے اوپر تک نہیں آ سکے اور نیچے وادی میں ہم دونوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم پانی کی خالی بوتل آپ کے پاس لائے تھے کہ آپ سے تھوڑا سا پانی لے کر ہم سب پی لیں گے مگر آپ نے بوتل اندر لانے ہی نہیں دی اور اب یہ پیاس سے بے ہوش ہو گیا ہے یا پھر......!!''

اس بچے نے نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ، بہت آہستہ آہستہ بولتے ہوئے کہا جیسے اس میں زیادہ بولنے کی سکت نہ ہو۔ مسٹر ابو نے گھبرا کر بے ہوش بچے کو ہلایا اور پھر بھاگ کر باہر آ گئے اور دروازے کے پاس پڑی بوتل کو اٹھایا۔ ان کے گھر میں پانی بالکل ختم تھا، اس لیے کہ وہ بہت کم پانی پیتے اور استعمال کرتے تھے۔ مسٹر ابو نے بارش کے پانی سے بوتل بھری اور واپس بھاگتے ہوئے ان دونوں بچوں کے پاس آئے جو نیم بے ہوش تھے۔ مسٹر ابو نے دونوں کے منہ سے پانی کی بوتل لگائی۔ دونوں نے بمشکل گھونٹ گھونٹ پانی پیا تھا۔ اس دوران بارش رُک چکی تھی۔ مسٹر ابو کچھ سوچتے ہوئے، پانی کی بوتل لیے پہاڑ سے نیچے اترنے لگے جہاں ان دونوں بچوں کے ساتھی ان کے واپس آنے کے منتظر تھے۔

مسٹر ابو جب نیچے پہنچے تو ٹھٹک کر رُک گئے۔ نیچے چھ سات بچے موجود ضرور تھے مگر وہ بھوک اور پیاس کی شدت سے کب کے مر چکے تھے!! مسٹر ابو نے حیرت اور خوف سے ان کی طرف دیکھا۔ پانی کی

بوتل ان کے ہاتھ سے گرگئی۔ وہ واپس بھاگتے ہوئے پھولی سانسوں کے ساتھ اوپر پہنچے۔ وہ دونوں بچے نیم وا آنکھوں سے انہیں واپس آتا دیکھ رہے تھے۔ مسٹر ابو نے کچھ سوچ کر اپنے گلوب پہ انگلی رکھی اور دنیا کے غریب اور ترقی پذیر ممالک کا جائزہ لینے لگے۔ غربت، بھوک، پیاس نے کتنے ہی معصوم اور غریب بچوں کی جان لی تھی۔ ایتھوپیا میں بچوں کی حالت زار دیکھ کر مسٹر ابو کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ان کا دل، دکھ کی شدت سے پھٹنے والا ہوگیا۔

''میں نے آج تک کتنی بے خبر اور مست زندگی گزاری ہے۔ جس بارش سے اتنا چڑتا تھا، وہ بارش کتنے لوگوں کے لیے رحمت اور زندگی کی امید ہے، مجھے پتا ہی نہ تھا......!'' مسٹر ابو ان دونوں بچوں کے پاس پہنچے اور زمین پہ بیٹھ گئے۔ اپنے دونوں بازو وا کر کے ان نیم بے ہوش اور بے جان ہوتے بچوں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ پانی سے چڑنے اور اپنے گھر میں پانی کے ایک قطرے کو بھی برداشت نہ کرنے والا، مسٹر ابو دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ان دونوں بچوں نے حیرت سے انہیں روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس دن مسٹر ابو اتنا روئے کہ ان کے آنسوؤں سے ساری کتابیں، سارے کاغذ بھیگ گئے تھے۔ ان کا دل انسانیت کی تکلیف اور درد پہ تڑپ اٹھا تھا اور ان کے آنسوؤں نے سیلاب کی صورت اختیار کرلی تھی جس میں یہ مثلث نما بنا گھر ڈوب چکا تھا۔

اس دن کے بعد سے مسٹر ابو جتنے سال بھی جیئے، انسانیت کی خدمت کرتے رہے ان دو بھوکے پیاسے بچوں کو انہوں نے بچالیا تھا مگر دنیا کے کونے کونے میں نجانے کتنے ہی معصوم بچے، غربت کی چکی میں پستے، اسی بھوک و پیاس سے مرجاتے ہیں۔

بہت دیر سے ہی سہی مگر مسٹر ابو نے یہ راز جان لیا تھا کہ بیٹھ کر لمبی لمبی باتیں کرنے سے لاکھ گنا بہتر ہے کہ ہم عملی طور پر ''انسانیت'' کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کریں۔ اس دن کے بعد سے مسٹر ابو نے کبھی کوئی وش یا خواب نہیں لکھا تھا۔ اس لیے کہ وہ جان گئے تھے کہ خدا کے لاتعداد فرشتے یہ کام بہت اچھے طریقے سے کر رہے ہیں اور اس تک پہنچا رہے ہیں مگر ہمیں خود اس خدا تک پہنچنے کے لیے خواہش کی نہیں بلکہ ''عمل'' کی ضرورت ہے۔ ''انسان کا افضل ہونا اس کی ''انسانیت'' میں چھپا ہوا ہے اور انسانیت کا تعلق کسی بھی مخصوص رنگ، نسل یا قوم سے نہیں ہوتا ہے۔

''انسانیت'' کا تعلق صرف ''انسان'' سے ہوتا ہے اور مسٹر ابو نے خود کو ایک اچھا اور بہتر ''انسان'' ثابت کرنا تھا اور ''انسانیت'' کا بہت سا قرض اتارنا تھا تاکہ کل کو کوئی بچہ بھوک، پیاس کی شدت سے موت کے منہ میں نہ چلا جائے۔ بچے تو سارے ایک جیسے ہوتے ہیں چاہے تھر یا چولستان کے ریگستانوں کے ہوں یا بھوک پیاس سے بلکتے ایتھوپیا، صومالیہ جیسے اور بہت سے ممالک کے ہوں۔ خواب اور خواہشات بھلے سب کی ایک جیسی نہ ہوں مگر بنیادی ضرورتیں سب کی ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ اس دن کے بعد سے مسٹر ابو نے کبھی بھی بارش کو بُرا نہیں کہا تھا کیوں کہ وہ جان گئے تھے کہ خدا کی دی گئی نعمتوں کی ناشکری نہیں کرنی چاہیے اور مسٹر ابو ایک اچھے اور رحم دل انسان تھے اور ایسے لوگ ناشکرے نہیں ہوتے ہیں!

☆☆

شب قدر

شب قدر جاگنے کا مزا اور ہی کچھ ہے
اس شب میں مانگنے کا مزا اور ہی کچھ ہے
مانگو جو مانگتے ہو ملے گا ضرور پر!
اس رب کریم کی عطا اور ہی کچھ ہے
یوں تو ہے شب قدر برابر ہزار سال
یہ کچھ بھی نہیں اس سے سوا اور ہی کچھ ہے
آؤ کہ شب قدر میں سب کچھ سمیٹ لیں
اس شب میں تو دیتا ہے خدا اور ہی کچھ ہے
مومن پہ ہمہ وقت ہیں رحمت کی گھٹائیں
اس شب میں تو رحمت کی گھٹا اور ہی کچھ ہے
ہر ایک گناہ گار پہ بخشش کی نظر ہے
اس شب میں تو مولا کی ادا اور ہی کچھ ہے
روشن شب قدر ہے خورشید سے بڑھ کر
عاجز مگر اس شب کی ضیاء اور ہی کچھ ہے

افضال عاجز

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ گھڑی کے اسپرنگ کا تناؤ کون سی توانائی کہلاتا ہے؟

i۔ شمسی توانائی ii۔ پوٹینشل توانائی iii۔ ایٹمی توانائی

2۔ لفظ اذان کے کیا معنی ہیں؟

i۔ سنی جانے والی ii۔ مانی جانے والی iii۔ نیکی کی بات

3۔ چھٹے کلمے کا کیا نام ہے؟

i۔ ردِ کفر ii۔ کلمۂ توحید iii۔ کلمۂ شہادت

4۔ تانبا اور ٹن ملانے سے کون سی چیز بنتی ہے؟

i۔ لوہا ii۔ کانسی iii۔ پیتل

5۔ دریائے سندھ کا دوسرا نام کون سا ہے؟

i۔ شالامار ii۔ اباسین iii۔ مہران

6۔ روشنی کی چمک کی اکائی کا کیا نام ہے؟

i۔ ریز ii۔ لیومن iii۔ برقیہ

7۔ گولف کے میدان کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ رنگ ii۔ لنک iii۔ پارک

8۔ پاکستان کے کس شہر کو شیروں کا شہر کہا جاتا ہے؟

i۔ گجرات ii۔ منڈی بہاؤ الدین iii۔ ملتان

9۔ کس اسلامی ملک کا جھنڈا سرنگوں نہیں ہوتا؟

i۔ مصر ii۔ سعودی عرب iii۔ افغانستان

10۔ علامہ اقبالؒ کے مرشد کون تھے؟

i۔ مولانا روم ii۔ حافظ شیرازی iii۔ شیخ سعدی

جوابات علمی آزمائش جون 2014ء

1۔ روزہ دار 2۔ خانہ کعبہ 3۔ تغلق 4۔ نظیر اکبر آبادی 5۔ 9 نومبر 1914ء 6۔ کورونا 7۔ سکر 8۔ ریڈکلف لائن 9۔ 5 اگست 1947ء تا 11 ستمبر 1947ء 10۔ مولوی عبدالحق

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ عائشہ تبسم، لاہور (150 روپے کی کتب)

☆ محمد حذیفہ فارانی، اسلام آباد (100 روپے کی کتب)

☆ شمیمہ نسیم، کراچی (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

عبید شریف، میانوالی۔ حدیقہ عارف، لاہور۔ عنیزہ علی لوہانی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ثمر خان، بھکر۔ رضوان اشہد، پشاور۔ عروبہ فاطمہ بٹ، نواب شاہ۔ وانیہ شیخ، کوٹری۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ اریبہ، صہیب، حبا، راولپنڈی۔ محمد قمر الزمان، خوشاب۔ محمد شہریار رمضان، ننکانہ صاحب۔ محمد علی رفیق، راول پنڈی۔ محمد صفی خان، پشاور۔ ثمرن عظیم، اسلام آباد۔ آمنہ بنت حبیب الرحمٰن، کراچی۔ زینب انوار، رحیم یار خان۔ ولید احمد، گوجرانوالہ۔ محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ مریم شہباز راجپوت، گوجرانوالہ۔ اسد محمد خان، میانوالی۔ ہمایوں رشید، اسلام آباد۔ فتح محمد شارق، خوشاب۔ ملک محمد فرحان، واہ کینٹ۔ عائشہ صدیقہ، پشاور۔ ہمایوں اسلم چوہدری، قصور۔ مزمل علی جعفری، شور کوٹ۔ اشراح امین، لاہور۔ سید محمد علی حسن، لاہور۔ محمد احمد ریاض، اوکاڑہ۔ غالیہ ارم، لاہور۔ محمد نعیم امین، لاہور۔ اقدس اکرام، اٹک۔ مصباح صادق، لاہور۔ علشبہ بتول، لاہور۔ اشفاق احمد، کراچی۔ ام فاطمہ، گجرات۔ ثمر ناز، کوٹ ادو۔ خدیجہ نور، کوئٹہ۔ روحی اصغر، لاہور۔ عمران علی، سرگودھا۔ شمیم اختر، ساہی وال۔ محمد عبداللہ فاروق، راول پنڈی۔ مریم صفدر، گجرات۔ حانقہ مزمل، پشاور۔ ملک مختار اعوان، سرگودھا۔ شہریار علی، پسرور۔ ذوالقرنین حسین، حیدر آباد۔ زینب اظہر، سبی۔ محمد جبار، خوشاب۔ نمرہ سعید، گوجرانوالہ۔ ارم نواز، جڑانوالہ۔ عائشہ نوید، سیال کوٹ۔ عبید اللہ انور، پشاور۔ کرن بٹ، جہلم۔ ثوبیہ آفاق، کراچی۔ وقار حبیب، خانیوال۔ عمران ارشد، ملتان۔

مختصر مختصر

حمد باری تعالیٰ

وہ جو اپنی مخلوق پہ کرم فرماتا ہے
وہ جو پتھروں میں بھی کیڑوں کو رزق پہنچاتا ہے

دیتا ہے ہدایت جو گناہ گاروں کو بھی
وہ جو سارے جگ کو کھلاتا ہے

چلتی ہیں ہوائیں بھی اسی کے حکم سے
وہ جو بادلوں سے بارش کو برساتا ہے

چمکاتا ہے دن کو، دے کر سورج کو روشنی
وہ جو چاند ستاروں سے آسمان کو سجاتا ہے

دکھا دیتا ہے کبھی قدرت کے ایسے بھی نظارے
وہ جو کبھی فقیروں کو بادشاہ بناتا ہے

مانگتی ہے مریم اسی سے بھلائی کی دعائیں
وہ جو بن مانگے بھی بگڑے کام بناتا ہے

(کاوش: مریم صدیقہ، گجرات)

چھٹی کا دن

جب بھی چھٹی کا دن آیا
ہر بچے کا دل لہرایا
بچو لیکن یاد رکھنا
وقت کو تم برباد نہ
اپنے بستے کو تم چیک کر لو
خالی پین تم سیاہی سے بھر لو
کاپی قلم کتاب کو دیکھو
پنسل، ربڑ حساب کو دیکھو
اپنی وردی کو دھو لو
کھیلو، کودو، نماز پڑھو اور سو لو
کل کے لیے تم رہو تیار
سکول سے تاکہ پڑے نہ مار
چھٹی کا دن مت ضائع کرنا
اس دن بھی کچھ لکھنا پڑھنا

(جویریہ یونس، لاہور)

غیبت

حضرت حسن بصریؒ سے کسی نے آ کر کہا: "فلاں شخص نے آپ کی غیبت کی ہے۔" حضرت حسن بصریؒ نے اسی وقت تازہ چھوہارے منگوائے اور ایک طباق میں رکھ کر اس شخص کے پاس ہدیے کے طور پر بھیجے اور کہلا بھیجا: "میں آپ کا بڑا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری غیبت کر کے اپنی نیکیوں کو میرے نامہ اعمال میں منتقل کر دیا ہے۔ آپ کے احسان کا بدلہ میں نہیں چکا سکتا تاہم یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمائیے۔ وہ شخص حضرت حسن بصریؒ کے اس حسن سلوک سے اتنا متاثر ہوا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی مانگی۔

(عائشہ ادریس، علی پور)

سنہرے اقوال

☆ کسی کو غم دینے میں آپ کو خوشی تو مل سکتی لیکن کسی کو خوشی دینے میں آپ کو غم نہیں مل سکتا۔ (حضرت علیؓ)

☆ اگر زندگی کو ہمیشہ خوشیوں کے سہارے گزارنا چاہتے ہو تو غم زدہ لوگوں کے غم سنا کرو، کبھی دکھی نہیں ہو گے۔ (حضرت علیؓ)

☆ لمبی امیدوں سے دور رہو کیوں کہ وہ تمہارے پاس موجود نعمتوں کو حقیر بنا دیتی ہیں۔

☆ غصے کی حالت میں انصاف کرنا مشکل ہوتا ہے۔ (حضرت عمرؓ)

☆ دُنیا کی عزت مال سے ہے اور آخرت کی اعمال سے۔ (حضرت عمرؓ)

(آمنہ سلام، اسلام آباد)

اقوالِ داستان شاہ

☆ جو شخص خود کو اصلاح سے مبرا سمجھتا ہے، وہی سب سے زیادہ قابلِ اصلاح ہے۔

☆ جس شخص میں تنقید سہنے کی ہمت نہیں ہوتی، سب سے زیادہ تنقید اسی پر کی جاتی ہے۔

☆ کتاب بہترین ساتھی ہے اور کتاب خوانی سب سے بہترین مصروفیت ہے۔

☆ اچھی تقدیر محنت کے قلم سے لکھی جاتی ہے۔

☆ آزادی کا شجر شہیدوں کے خون سے پروان چڑھتا ہے۔

(خدیجہ نشان، کاموکی)

دوستی

☆ خدا کے نزدیک بہترین دوست وہ ہے جو اپنے دوست کا خیر خواہ ہو۔

☆ غریبوں کے ساتھ ہمیشہ دوستی رکھ جب کہ امیروں کی مجلس سے پرہیز کر۔

☆ دشمن ایک بھی بہت ہے۔ دوست زیادہ بھی تھوڑے ہیں۔

☆ غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔

☆ اگر کوئی قابل شخص دوستی کے لیے نہ ملے تو نااہل سے دوستی مت کر۔

سنہری باتیں

☆ علم عمل کو آواز دیتا ہے، پس اگر وہ جواب دے تو ٹھہرتا ہے ورنہ کوچ کر جاتا ہے۔

☆ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ بدلہ نہیں لیتا۔

☆ آدمی کے اسلام کی خوبی امورِ بے فائدہ کو چھوڑ دینا ہے۔

☆ اگر تمہارا کھانا حسبِ خواہش نہ ہو تو اس کو برا نہ کہو۔

☆ تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔

(سیدہ زوارہ حسین، لاہور)

جنت

جماعت میں استاد طالب علموں سے گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگا:
''تم میں سے جو طالب علم مجھے مٹھی بھر جنت کی مٹی لا کر دے تو وہ تم میں کامیاب طالب علم ہوگا۔''

اگلے دن ایک چھوٹا بچہ مٹھی بھر مٹی لے کر استاد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ استاد نے مٹی دیکھی تو کہنے لگا: ''بیٹا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو بھلا جنت کی مٹی ہم کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟''

بچے نے نم آنکھوں کے ساتھ معصومیت سے کہا: ''جناب یہ مٹی میں اپنی ماں کے قدموں کے نیچے سے لایا ہوں۔ آپ ہی نے تو ہمیں سکھایا ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔''

(محمد اجمل شاہین انصاری، چونگ)

مساوات

زندگی بے بس خاموش پرندے کی طرح وقت کو اڑاتی، دبے پاؤں کٹے جا رہی ہے۔ جیسے کوئی ہوا اپنے ساتھ خس و خاشاک سب اڑا لے جائے۔ غم پھانس بن کر کبھی سانس روکتے ہیں مگر خوشی کا نوالہ نگلتے ہی سانس پھر بحال ہو جاتے ہیں۔

یہاں کچھ ایسے ہیں جو ایک مسکراہٹ اور خوشی کے ایک پل کو ترستے ہیں اور کچھ ایسے ہیں، جو خوشیوں سے دامن بھرے چاندی ٹھنڈک میں گزارتے ہیں اور کچھ تو کفن بھی ادھار کا پہنا کرتے ہیں لیکن یہاں مساوات ہے کیوں کہ قبر امیر اور غریب کی ایک ہی مٹی سے تیار ہو جاتی ہے۔

(حافظ محمد اسامہ بن طاہر، چکی)

اچھی باتیں

☆ ہر عمل کے اندر سے اس کا انجام یوں چھپا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔

☆ اپنے آپ سے زبردستی مت کریں ورنہ ٹوٹ جائیں گے۔

☆ امن کی فاختہ وہیں اترتی ہے جہاں پیار، صلح اور صبر کی دھوپ پھیلتی ہے۔

☆ اندھیرے سے مت گھبراؤ کیوں کہ جگنو ہمیشہ اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔

(نعمان شکیل، لاہور)

☆☆☆

پولو

کھیلوں کا بادشاہ اور بادشاہوں کا کھیل

پولو جسے کھیلوں کا بادشاہ اور بادشاہوں کا کھیل کہا جاتا ہے، محققین کے مطابق پولو نے وسطی ایشیا میں جنم لیا، ایران میں پرورش پائی اور گلگت بلتستان اور چترال میں جوان ہوا۔ پولو کو ''چوگان'' بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک پولو کے کھیل کا بہت شوقین تھا۔ قطب الدین کی موت بھی پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ہوئی تھی۔ قطب الدین ایبک اصل میں کون تھا؟ پولو کے کھیل سے پہلے اس کھیل کے شوقین بادشاہ کے بارے میں آپ کو بتاتے ہیں جس کی وجہ سے اسے بادشاہوں کا کھیل کہا جاتا ہے۔

قطب الدین ایبک کا اصل وطن ترکستان تھا جہاں وہ ایبک نامی ایک ترک قبیلے میں پیدا ہوا، اسی لیے قطب الدین ایبک کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب بہت سے ملکوں میں غلاموں کی خرید و فروخت کا کام ہوتا تھا۔ قطب الدین کو اس کے بچپن میں ایک سوداگر ترکستان سے خرید کر ایران کے شہر نیشا پور لے گیا اور پھر وہاں ایک قاضی فخر الدین عبدالعزیز کوفی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ یہ قاضی بہت بڑے عالم تھے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے اور نیشا پور کے قریبی علاقوں کے حاکم بھی تھے۔ انہوں نے قطب الدین کو بہت اچھی طرح رکھا۔ قرآن مجید اور دوسرے دینی علوم کی تعلیم بہت توجہ اور شفقت سے دی کہ وہ عالم فاضل ہو گئے۔ قطب الدین کو قرآن مجید سے اس قدر لگاؤ تھا کہ لوگ انہیں ''قرآن خواں'' کہنے لگے تھے۔ نیشا پور ہی میں قطب الدین ایبک نے تلوار بازی، نیزہ بازی، تیر اندازی اور شہسواری کے فنون سیکھے اور پولو (چوگان) کے کھیل سے دل چسپی تھی۔

قاضی کی وفات کے بعد قاضی کے ایک صاحب زادے نے قطب الدین کو ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس تاجر نے قطب الدین کو سلطان شہاب الدین محمد غوری کی خدمت میں پیش کیا لیکن سلطان نے قطب الدین کو قیمت دے کر خرید لیا۔ غلام قطب الدین نے اپنے نئے مالک سلطان شہاب الدین محمد غوری کی خوب خدمت کی اور وہ سلطان کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ سلطان نے قطب الدین کو اپنے درباری امیروں میں داخل کر لیا اور ایک اعلیٰ عہدے پر بھی فائز کر دیا اور اس کے بیٹھنے کے لیے اپنے تخت کے سامنے ایک خاص جگہ مقرر کر دی تھی۔ جب سلطان اور خراسان کے بادشاہ کے درمیان لڑائی چھڑ گئی تو اس جنگ میں قطب الدین دشمن کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے، لیکن دشمن کی فوج کے گھیرے میں آ گئے اور گرفتار ہوئے۔ دشمن نے اسے لوہے کے ایک پنجرے میں بند کر کے قید کر دیا تھا۔ پھر چند دن بعد سلطان شہاب الدین محمد غوری کے لشکر نے دشمن کو شکست دی۔ جس لوہے کے پنجرے میں قطب الدین قید کیا گیا تھا اسے ایک اونٹ پر لاد کر سلطان کے سامنے لایا گیا تو سلطان نے خود قطب

الدین کو لوہے کے پنجرے سے نکالا اور اس کے گلے میں جو زنجیر تھی اس کی جگہ گلے میں ہیروں کا ہار پہنا دیا۔

یہ 1191ء کی بات ہے جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے شمالی ہندوستان کا رخ کیا اور اجمیر، دہلی وغیرہ فتح کر کے ان پر قطب الدین کو حاکم بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کو اس فوج کا سپہ سالار بنا دیا جو اس نے ہندوستان میں چھوڑی اور خود واپس غزنی چلا گیا۔ قطب الدین نے سلطان کے جانے کے بعد میرٹھ اور رنتھنبور سمیت کئی اور علاقے فتح کر لیے۔ سلطان نے قطب الدین کو غزنی بلا کر بے شمار انعامات سے نوازا۔ قیمتی تحائف کے ساتھ قطب الدین نے غزنی واپس آ کر کئی اور علاقے فتح کر لیے۔ محمد غوری نے اسے ہندوستان کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ جب سلطان غوری نے قنوج اور بنارس کے راجہ سے جنگ کرنے کے لیے ہندوستان کا رخ کیا تو قطب الدین نے ان کی خدمت میں پچاس ہزار سوار، سو عربی گھوڑے اور سینکڑوں ہاتھی اور اونٹ پیش کر دیئے اور سلطان کے ساتھ مل کر قنوج اور بنارس فتح کیے۔ اس لڑائی میں قطب الدین نے خوب بہادری دکھائی کہ سلطان نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ قطب الدین اور اس کے فوجی سرداروں کی فوجوں نے گجرات، راجپوتانہ، دریائے گنگا اور جمنا کا دوآبہ، بہار اور بنگال فتح کر لیے۔

1206ء میں سلطان شہاب الدین غوری ہندوستان کی آخری مہم کے بعد پنجاب کے راستے اپنے وطن واپس جا رہا تھا۔ جہلم کے قریب دمیک کے مقام پر بعض دشمنوں نے انہیں رات کو اس وقت شہید کر دیا جب وہ اپنے خیمے کے اندر سو رہے تھے۔ سلطان کی شہادت کے بعد سلطان کا بھتیجا محمود جانشین بنا۔ اس نے بھی قطب الدین کو بہت عزیز رکھا اور خوب عزت دی اور سلطان کا خطاب دے کر شمالی ہندوستان کے فتح کیے ہوئے سارے علاقوں لاہور اور دہلی سمیت کا خودمختار بادشاہ بنا دیا۔ قطب الدین بادشاہ بن کر بھی رعایا کا خادم رہا۔ لوگ اس سے محبت کرتے اور دعائیں دیتے تھے۔ قطب الدین کی سخاوت کی وجہ سے رعایا نے ان کو "لکھ بخش" کا خطاب دیا تھا جس کا مطلب حاجت مندوں پر لاکھوں روپے کی بارش کرنے والا۔ لوگوں نے قطب الدین کو حاتم ثانی بھی کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی سخاوت پورے شمالی ہندوستان کو اپنا مطیع بنا گئی۔ ہندوستان میں ان کا ایک بھی دشمن نہ تھا، دریا دلی اور سخاوت نے لوگوں کے دل موہ لیے تھے۔

1206ء میں سلطان کی وفات کے بعد خاندان غلاماں کی بنیاد رکھی، اس کے بعد خاندان غلاماں سے نو اور حکمران آئے۔ قطب الدین نے بادشاہ بنتے ہی مسلمانوں کو اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کی اور بری رسموں سے پرہیز کرنے کی تاکید کی۔ ساتھ ہی عدل و انصاف کی ایسی مثال قائم کی کہ آئندہ نسلوں کے لیے نمونہ بن گئی۔ قطب الدین کے دور میں کسی طاقتور کی مجال نہ تھی کہ کسی کم زور پر ظلم کر سکے۔ ان کے لشکر میں ترک، افغان، غوری اور خلجی وغیرہ شامل تھے۔ سب مل کر رہتے کوئی کسی کے ساتھ ناانصافی نہ کرتا، تمام رعایا خوش حال، مطمئن زندگی بسر کرتی تھی۔ مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی مسلمانوں کے ساتھ سخاوت سے حصہ پاتے تھے۔ قطب الدین دینی مدارس اور دین کے عالموں کی مالی سرپرستی کرتے، مختلف علوم و فنون میں کمال رکھنے والے وظیفے پاتے تھے۔ ان میں قاری، ادیب، صوفی اور شاعر شامل تھے۔

قطب الدین عمارتوں کے فن کے موجد تھے، دہلی اور دوسری جگہوں پر پتھر کی شان دار عمارتیں بنوائیں۔ دہلی اور اجمیر میں شان دار مسجدیں بھی تعمیر کروائیں۔ قطب الدین کی بادشاہت کا زمانہ حکومت صرف چار برس رہا۔ 1210ء میں پولو (چوگان) کھیلتے ہوئے اچانک گھوڑے سے گر کر سخت زخمی ہوئے اور پھر انتقال کر گئے۔ لاہور میں پولو کھیلتے ہوئے وفات پانے والے بادشاہ قطب الدین ایبک کو لاہور کے انارکلی بازار میں دفن کیا گیا جہاں ان کا مقبرہ تعمیر کر دیا گیا جو سیاحوں کے لیے توجہ کا مرکز ہے۔ اس سخی، علم دوست اور عدل و انصاف کے بادشاہ کا نام تاریخ میں کئی حوالوں کے ساتھ زندہ رہے گا۔ اس میں ایک حوالہ پولو کھیل کا بھی ہے جو پُرخطر مگر دلچسپ کھیل ہے۔ جب بھی پولو کھیل کا ذکر ہوگا قطب الدین ایبک کا ذکر بھی ہوگا۔ شاید اسی لیے اس کھیل کو کھیلوں کا بادشاہ اور بادشاہوں کا کھیل کہا جاتا ہے کہ مسلمان بادشاہ اس کھیل کا شوقین تھا اور اس کھیل کو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر فوت ہوا تھا۔ پولو کیسے کھیلا جاتا ہے اور پاکستان میں کن علاقوں میں یہ کھیل مشہور ہے آئندہ شمارے میں بتائیں گے۔ ☆☆☆

روزہ کے مسائل

مفتی محمد معاویہ اسماعیل

وہ عذر جن سے روزہ نہ رکھنا جائز ہو جاتا ہے:
☆سفر یعنی مسافر کو حالت سفر میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے لیکن اگر سفر میں مشقت نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے۔ ☆مرض یعنی ایسی بیماری جس میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو یا بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ ☆بہت بوڑھا ہونا۔ ☆دودھ پلانا، جبکہ دودھ پلانے والی کو یا بچے کو روزے سے نقصان پہنچتا ہو۔ (اگر دودھ پلانے والی کو دودھ پلانے کے باوجود روزہ نقصان نہ دے تو پھر روزہ رکھنا ضروری ہے) ☆روزہ سے اس قدر بھوک یا پیاس کا غلبہ ہو کہ جان نکل جانے کا اندیشہ ہو جائے۔

روزے کے مستحبات یہ ہیں:
☆سحری کھانا۔ ☆رات سے نیت کرنا۔ ☆سحری آخری وقت میں کرنا بشرطیکہ صبح صادق سے پہلے فارغ ہو جائے۔ ☆افطار میں جلدی کرنا۔ (یعنی جب افطاری کا وقت ہو جائے تو افطار کرنے میں تاخیر نہ کرنا) ☆غیبت، جھوٹ، گالی گلوچ وغیرہ اور بُری باتوں سے بچنا۔ ☆چھوہارے یا کھجور سے روزہ افطار کرنا اور اگر یہ نہ ہوں تو پانی سے افطار کرنا۔

روزے میں جو باتیں مکروہ ہیں:
☆گوند چبانا یا کوئی اور چیز منہ میں ڈالے رکھنا۔ ☆کوئی چیز چکھنا۔ ہاں جس عورت کا خاوند سخت اور بدمزاج ہو اسے زبان کی نوک سے سالن کا نمک چکھ لینا جائز ہے۔ ☆کلی یا ناک میں پانی ڈالنے میں مبالغہ کرنا۔ ☆منہ میں بہت سا تھوک جمع کر کے نگلنا۔ (۵) غیبت کرنا، جھوٹ بولنا، گالی گلوچ کرنا۔ ☆بے قراری اور گھبراہٹ ظاہر کرنا۔ ☆نہانے کی حاجت ہو جائے تو غسل کو قصداً صبح صادق کے بعد تک مؤخر کرنا۔ ☆کوئلہ چبا کر یا منجن سے دانت مانجھنا۔

جن چیزوں سے روزہ مکروہ نہیں ہوتا: ☆سرمہ لگانا۔ ☆بدن پر تیل ملنا یا سر میں تیل ڈالنا۔ ☆ٹھنڈک کے لیے غسل کرنا۔ ☆مسواک کرنا اگرچہ تازی ہو، جڑ یا تر شاخ کی ہو۔ ☆خوشبو لگانا یا سونگھنا۔ ☆بھولے سے کچھ کھا پی لینا۔ ☆خود بخود بلاقصد قے ہو جانا۔ ☆اپنا تھوک نگلنا۔ ☆بلاقصد مکھی یا دھوئیں کا حلق سے اُتر جانا۔

جن مفسدات سے صرف قضاء واجب ہوتی ہے وہ یہ ہیں:
☆کسی نے زبردستی روزہ دار کے منہ میں کوئی چیز ڈال دی اور وہ حلق سے اُتر گئی۔ ☆روزہ یاد تھا اور کلی کرتے وقت بلاقصد حلق میں پانی اُتر گیا۔ ☆قے آئی اور قصداً حلق میں لوٹا لی۔ ☆قصداً منہ بھر کرتے کر ڈالی۔ ☆کنکری یا پتھر کا ٹکڑا یا گٹھلی یا مٹی یا کاغذ کا ٹکڑا قصداً نگل لیا۔ ☆دانتوں میں رہی ہوئی چیز کو زبان سے نگل کر جب کہ وہ چنے کے دانے کے برابر یا زیادہ ہو۔ اگر منہ سے باہر نکال کر پھر نگل لیا تو چاہے چنے سے کم ہو یا زیادہ، روزہ ٹوٹ گیا۔ ☆کان میں تیل ڈالا۔ ☆دانتوں میں سے نکلے ہوئے خون کو نگل لیا جب کہ خون تھوک پر غالب ہو۔ ☆بھولے سے کچھ کھا پی لیا اور یہ سمجھ کر کہ روزہ ٹوٹ گیا ہے، پھر جان بوجھ کر کھا لیا۔ ☆یہ سمجھ کر کہ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی سحری کھا لی، پھر معلوم ہوا کہ صبح ہو چکی تھی۔ ☆رمضان شریف کے سوا اور دنوں میں کوئی روزہ قصداً توڑ ڈالا۔ ☆ابر یا غبار کی وجہ سے یہ سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہو گیا ہے، روزہ افطار کر لیا حالاں کہ ابھی دن باقی تھا۔ ان سب صورتوں میں صرف ان روزوں کی قضا رکھنی پڑے گی جن میں ان باتوں میں کوئی بات پیش آئی۔

رمضان شریف کے مہینے میں اگر کسی کا روزہ ٹوٹ جائے تو پھر بھی کھانا پینا جائز نہیں بلکہ اس کو لازم ہے کہ شام تک کھانے پینے وغیرہ سے رکا رہے، ان لوگوں کو بھی باقی دن میں شام تک روزہ داروں کی طرح رہنا واجب ہے۔

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/ جولائی 2014ء ہے۔

نام: ____________
شہر: ____________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/ جولائی 2014ء ہے۔

نام: ____________
مقام: ____________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

جولائی کا موضوع "ہوٹل" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08/ جولائی 2014ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________
مقاصد ____________
موبائل نمبر: ____________

اوجھل خاکے

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

میری زندگی کے مقاصد

فاطمہ ولی خان، لاہور
میں باکمال، پرہیزگار اور مومنہ ہوں گی۔

محمد عبداللہ ہاشم، لاہور
میں کرکٹر بن کر پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

محمد شعیب انور، واہ کینٹ
میں بڑا ہو کر حافظ قرآن اور انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

عبدالاحد شاہ، لاہور
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔

[illegible] کامران، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہوں اور ملک و قوم کا نام روشن کروں گی۔

محمد عبداللہ انعام، گجرات
میں عالم دین بن کر حق کی پاس داری کروں گا۔

مرتضیٰ احمد، کراچی
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔

تحریم عثمان، گوجرانوالہ
میں ان شاء اللہ ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔

محمد مبشر شفیق، لاہور
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا۔

مطیع الرحمٰن، لاہور
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

حنی بدر، لاہور
میں پائلٹ بنوں گی اور ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔

زینب عدنان، لاہور
میں سرجن ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

محمد احمد خان غوری، بہاولپور
میں آرمی جوائن کر کے ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

ماجد اقبال، کراچی
میں حافظ قرآن بنوں گا اور دین کی روشنی پھیلاؤں گا۔

حیدر علی رانا، کوٹ مومن
میں ایئر فورس جوائن کر کے ملک اور ماں باپ کا نام روشن کروں گا۔

احمد حسن خان، مردان
میں ایک اچھا انسان بن کر معاشرے میں مثبت تبدیلیاں لاؤں گا۔

احمد رزاق، مریدکے
میں کیمیکل انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

حامد علی گجر، جوہر آباد
میں اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی کوشش کروں گا۔

عابد رحمان، لاہور
میں پڑھ لکھ کر انجینئر بنوں گا۔

محمد ریان طیب، راولپنڈی
میں آرمی آفیسر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

محمد اسماعیل، اسلام آباد
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا۔

احتشام اسلم، لاہور
میں آرمی جوائن کر کے ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

علیزہ حسین، لاہور
میں ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

زینب بابر خان، راولپنڈی
میں پولیس آفیسر بن کر معاشرے میں جرائم کا خاتمہ کروں گی۔

محمد ریان طاہر، لاہور
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ملکی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

کھیل دس منٹ کا

د	ل	ب	ن	ا	ن	ج	ڑ	ذ	ب
ش	غ	ن	ا	ڈ	و	س	ظ	م	ض
ژ	ت	ط	ء	ش	پ	ح	ہ	ص	و
ا	ی	ٹ	ص	ر	ط	ق	ف	ر	ن
ظ	و	ی	خ	م	ن	م	ت	غ	د
ے	ک	ر	ب	ح	ر	ی	ن	چ	ر
غ	ر	ا	ف	ڈ	ل	ع	ز	ی	ا
م	ح	ق	ر	ی	ک	ر	ت	ز	س
ا	ک	ص	ش	ط	ک	س	م	ف	ل
ش	ع	گ	م	ا	ی	ر	ا	ن	ہ

آپ نے حروف ملا کر اسلامی ملکوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کرسکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

قطر، شام، لبنان، بحرین، مصر، کویت، ترکی، اردن، ایران، سوڈان

باجی (ننھی سے): تم آنکھیں بند کر کے مٹھائی کیوں کھا رہی ہو؟
ننھی: اس لیے کہ امی نے مٹھائی کی طرف دیکھنے سے منع کیا ہے۔

(علیزہ احمد، راول پنڈی)

استاد: تم دیر سے سکول کیوں آئے؟
شاگرد: سر! راستے میں بورڈ لگا یا گیا ہے۔ اس پر لکھا ہے کہ آگے سکول ہے، آہستہ چلیں۔

☆☆

مالک: کیا تمہیں جانوروں سے محبت ہے؟
نوکر: بالکل جناب! خاص طور پر بھنے ہوئے مرغ سے بہت محبت کرتا ہوں۔

☆☆

استاد: پرانے بادشاہوں کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟
شاگرد: وہ سب مر چکے ہیں۔

(انصر علی، وہاڑی)

ایک دکان دار پیرا شوٹ بیچ رہا تھا۔ گاہک نے پوچھا: اگر بٹن دبانے کے بعد پیرا شوٹ نہ کھلا تو؟
دکان دار: کوئی بات نہیں، تم دوسرا لے جانا۔

(صفار شید، کراچی)

راہ گیر (بچے سے): تم نے اپنی انگلی میں دھاگہ کیوں باندھا ہوا ہے۔
بچہ: یہ دھاگہ امی نے باندھا ہے تاکہ میں خط ڈالنا نہ بھول جاؤں۔
راہ گیر: تو کیا تم نے خط ڈال دیا؟
بچہ: نہیں، امی مجھے خط دینا ہی بھول گئی۔

(منیبہ عارف، ڈھکوٹ)

بس میں کھڑا ایک مسافر دوسرے سے کہنے لگا: جناب آپ کی عمر؟
دوسرے نے جھلا کر جواب دیا: 35 سال
پہلے مسافر نے بے ساختہ کہا: اس عمر میں تو یقیناً آپ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہیں، مہربانی کر کے میرے پیروں پر سے اتر جائیے۔

(وجیہہ بن جاوید، لاہور)

ماجد (عاطف سے): یار آج میرے گلے میں بہت درد ہے۔
عاطف: یار آج میرے سر میں بڑا درد ہے۔
ماجد: تو ٹھیک ہے تم میرا گلا دبا دو، میں تیرا سر دبا دیتا ہوں۔

(صبا شوکت، گوجرانوالہ کینٹ)

ایک آدمی خون کے بارے میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ بیوی نے پوچھا: خون کے بارے میں معلومات کیوں پڑھ رہے ہو؟
شوہر بولا: ڈاکٹر نے کہا ہے کل خون کا ٹیسٹ ہے، اس لیے تیاری کر کے آنا۔

☆☆

ایک دوا فروش مجمع میں اپنی دوا کی تعریف کر رہا تھا۔
حضرات! میں یہ دوا بیس سال سے فروخت کر رہا ہوں، آج تک یقین کریں کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔ مجمع سے آواز آئی کہ مرنے کے بعد کوئی شکایت نہیں کرتا۔

(روشن زیب)

ایک دوست (دوسرے دوست سے): میں کار میں جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں نے مجھے روک لیا۔ انہوں نے میری نقدی، گھڑی حتیٰ کہ کار بھی چھین لی۔
دوسرا دوست: لیکن تمہارے پاس ریوالور بھی تو تھا۔
پہلا دوست: شکر ہے ان کی نظر میرے ریوالور پر نہیں پڑی۔

(شہر بانو، فیصل آباد)

ایک لڑکا ملازمت کے لیے اپنی کار میں دوسرے شہر جانے لگا تو ماں باپ نے خیریت سے پہنچ جانے کی دعائیں دیں۔ لڑکے نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: بس مجھے آپ کی دعائیں چاہئیں۔
باپ نے جواب دیا: ہم دعا کرتے رہیں گے لیکن بیٹا، یہ یاد رکھنا کہ ہماری دعائیں صرف 50 میل فی گھنٹے کی رفتار سے ساتھ دے سکیں گی۔

☆☆

استاد (سلیم سے): تم گھر کا کام کیوں نہیں کر کے لاتے؟
سلیم: جناب میں ہوسٹل میں رہتا ہوں۔

☆☆

بیٹا: اماں، اماں! گاؤں میں ایک دانتوں کا ڈاکٹر آیا ہے۔
ماں: اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے۔ کیا ہم لوگوں کے دانت نہیں ہیں۔

(وجیہہ نسرین، لاہور)

غم زدہ مینا کی فریاد

(جس کا گھونسلا اس کے انڈوں سمیت برباد ہوا)

میں ہوں اک مظلوم مینا مامتا کا ایک نشاں
کیا بتاؤں کس قدر غم گیں ہے میری داستاں

کیا تمنائیں تھیں میری گھٹ کے جو اب رہ گئیں
لگ رہا ہے کہ زمیں سے مل گیا ہے آسماں

کس قدر مشکل سے دن بھر تنکا تنکا جوڑ کر
نامکمل سا بنا پائی تھی میں اک گھر یہاں

راکھ کر ڈالا کسی نے دیکھتے ہی دیکھتے
میری امیدوں کا مسکن میرا پیارا آشیاں

لٹ گیا میری امنگوں کا چمن سب لٹ گیا
اب مری آغوش میں ہیں آہیں، آنسو، سسکیاں

سخت تڑپاتی ہے اپنے ان جگر گوشوں کی یاد
جو ابھی تک تھے مکان و لا مکاں کے درمیاں

بے سر و سامان مجھ معصوم کو کس نے کیا؟
کیسا ظالم تھا مجھے جو کر گیا بے خانماں

دیکھنے والوں کو کیا معلوم میرا حالِ دل
غم کی پرچھائیں ہیں یا پھر میں ہوں ان کے درمیاں

ہوں مبارک آپ کو عشرت کدے اپنے ضیاء
مجھ کو کافی میرے رب کے آسماں کا سائباں

آنسہ ثروت ضیاء

غار حرا (Cave of Hira) کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس غار میں محبوب الٰہی حضرت محمد ﷺ عبادت کے لیے تشریف لاتے تھے۔

دُنیا کے ہنگاموں سے کچھ دیر کے لیے الگ تھلگ گوشۂ تنہائی میں آپؐ اپنے رب کو یہاں آ کر یاد کرتے۔ یہ غار مکہ سے 3.2 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ غار جبل النور نامی پہاڑ میں واقع ہے جو سعودی عرب کے علاقے حجاز میں ہے۔ یہ غار 3.7 میٹر (12 فٹ) لمبی اور 1.60 میٹر (5 فٹ 3 انچ) چوڑائی میں ہے۔ غار 270 میٹر (890 فٹ) بلند ہے۔ ہر سال لاکھوں مسلمان اس عظیم مقام کو دیکھنے آتے ہیں جہاں رسالت مآبؐ پر وحی آتی تھی۔ حضرت جبرئیلؑ آپؐ کے پاس اللہ رب العزت کے پیغامات لاتے۔ لوگ یہاں آ کر روحانی سکون حاصل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ غار پہاڑ کے سرے پر نہیں بلکہ اس کے پہلو میں ہے۔ چٹانیں اس طرح سے موجود ہیں کہ خیمہ معلوم پڑتا ہے۔ غار کا رخ کچھ اس طرح ہے کہ یہ اندر سے ٹھنڈی ہے اور سورج کی روشنی براہ راست اندر نہیں پہنچتی۔ نبی پاکؐ کئی کئی دن یہاں قیام فرماتے اور عبادت کرتے۔ حج کے موقع پر لاکھوں افراد یہاں آتے ہیں اور نوافل ادا کرتے ہیں۔ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے والوں کی بڑی تعداد بھی یہاں نوافل ادا کرنے آتی ہے۔

پاکستان سمیت دُنیا کے کئی علاقوں میں سموسے (SAMOSAY) بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ یہ گھی یا

تیل میں خوب تلی ہوئی پیسٹری نما خوراک ہے جس میں آلو، قیمہ یا چکن بھرا ہوتا ہے۔ خیال ہے کہ سموسے بنانے کی ابتداء مشرق وسطیٰ (مصر وغیرہ) سے ہوئی۔ بعدازاں مغلیہ عہد میں برصغیر پاک و ہند میں ان کی ابتداء ہوئی۔ آج یہ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش کے لوگوں کی پسندیدہ خوراک ہے جسے بطور تواضع استعمال کیا جاتا ہے۔ رمضان المبارک میں لاکھوں ٹن سموسے افطاری میں استعمال ہوتے

ہیں۔ لفظ سموسہ فارسی زبان کے لفظ سنبوساگ (Sambosag) سے نکلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا بھر کی زبانوں میں اسی سے ملتے جلتے نام ملتے ہیں۔ ایرانی مفکر ابوالفضل بیہقی (1077ء - 995ء) اور برصغیر کے نامور اسکالر و شاعر امیر خسروؒ نے اپنی اپنی کتابوں میں سموسوں کا ذکر کیا ہے۔ امیر خسروؒ (1325ء - 1253ء) میں لکھتے ہیں کہ مغل شہزادے اور شہزادیاں سموسے کھاتے تھے۔ ابن بطوطہ معروف سیاح نے بھی چودھویں صدی میں اپنی تحاریر میں
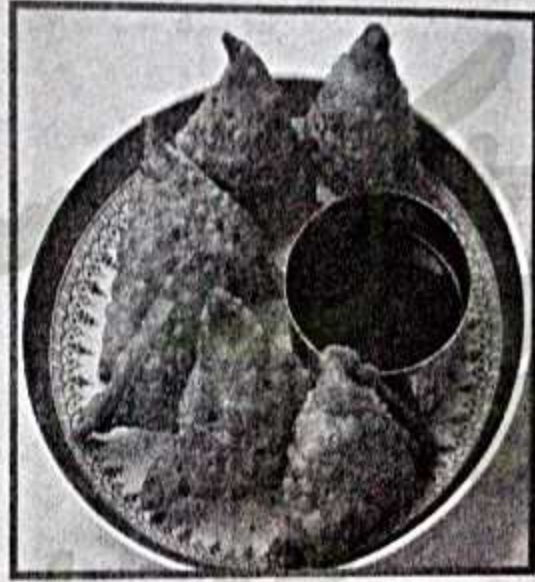
سموسوں کا ذکر کیا ہے۔ کراچی کے کاغذی سموسے دُنیا بھر میں مشہور ہیں۔ سموسے میں چکنائی بہت ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں کھانے سے جسم کا وزن بڑھتا ہے۔ دل کے مریضوں کو خاص طور پر احتیاط کرنی چاہیے۔ برما، نیپال، سری لنکا، ازبکستان، قازقستان، آذربائیجان، انڈونیشیا، اری ٹیریا، ایتھوپیا، صومالیہ، اسرائیل، مالدیپ، پرتگال، کینیا، عرب ممالک، برطانیہ و امریکہ میں بھی سموسے کھائے جاتے ہیں۔

نمک کا تیزاب

نمک کا تیزاب یا ہائیڈروکلورک ایسڈ (Hydro Chloric Acid) ایک شفاف، بے رنگ اور ناک میں چبھنے والا تیزاب ہے جو صنعت میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ ماضی میں اسے نمک کا سپرٹ (Spirit of Salt) کہا کرتے تھے۔ 13 ویں صدی میں پہلی بار اس تیزاب سے آگاہی ہوئی۔ ہائیڈروجن کلورائیڈ کو پانی میں حل کرنے سے یہ تیزاب حاصل ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ تیزاب اُڑ جاتا ہے اس لیے یہ گیسی تیزاب کہلاتا ہے۔ دُنیا بھر میں ہر سال یہ تیزاب 20 ملین میٹرک ٹن سے زیادہ پیدا ہوتا ہے جس کی بڑی مقدار فیکٹریوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اسٹیل کی تیاری میں بھی یہ تیزاب استعمال ہوتا ہے۔ پلاسٹک،

بیٹریوں کی تیاری، فوڈز، ادویات اور پانی صاف کرنے میں اس تیزاب کی بڑی اہمیت ہے۔ علاوہ ازیں چمڑے کی صفائی، پانی کی ٹینکی صاف کرنے اور "Food Additives" (ایسے مادے جو غذائیت کو برقرار رکھنے اور ذائقے کو محفوظ کرنے کے کام آتے ہیں) کی تیاری میں نمک کا تیزاب استعمال ہوتا ہے۔ انسانی معدہ (Stomach) کی دیواریں گیسٹرک جوس خارج کرتی ہیں جس میں ہائیڈروکلورک ایسڈ پایا جاتا ہے۔ اس کی پی ایچ 1.3 ہوتی ہے۔ یہ خامرے (Enzyme) پیپسن (Pepsin) کو متحرک کرتا اور غذا میں جراثیم کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اس تیزاب کے بخارات آنکھوں، جلد، پھیپھڑوں اور آنتوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ خطرناک تیزاب ہے، طلباء کو تجربہ گاہ میں احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے۔

بوجھو تو جانیں

1- اس کے کان پہ میرا منہ
میرے کان پہ اس کا منہ
پاس نہیں ہم دونوں پھر بھی
باتیں کیسے کریں؟ بتاؤ!
(جویریہ یونس، لاہور)

2- ایک دادا کے سو پوتے
چلتے پھرتے سب ہیں ساتھ
سب کے پیٹ میں ایک ہی آنت

3- ایک قلعہ میں برج ہزار
برج برج میں پہرے دار
کیا عجب قلعہ بنایا
نہ مٹی نہ چونا لگایا

4- رات سے کچھ موتی آئیں
دھوپ کے آتے ہی مٹ جائیں

5- کالی اس کی وردی ویسی اس کی چال
ہر گھر میں وہ ایسے پھرے جیسے کوتوال
(ثروت یعقوب، لاہور)

6- رعبہ رانی کہو کہانی
ایک گھڑے میں دو رنگ پانی

7- نہ کچھ کھائے نہ کچھ پیئے
دو ٹانگوں سے چلتا جائے

8- کالا گھوڑا اور سفید سواری
ایک کے بعد ایک کی باری
(نازیہ خان، لاہور)

راستہ بتاؤ:

نقطے ملاؤ اور رنگ بھرو:

شیر خرمہ

سامان اور وزن:

دودھ: ایک لیٹر — سویاں: ایک پیالی — چینی: دو پیالی — لونگ: دو عدد

بادام: دس سے بارہ عدد (چھلے اور باریک کٹے ہوئے) — پستے: پندرہ عدد (چھلے اور باریک کٹے ہوئے)

چھوٹی الائچی: چھ عدد (باریک کچل لیں) — گھی: دو کھانے کے چمچ — چھوارے: آٹھ عدد (گٹھلی نکال کر چار ٹکڑے کرلیں)

ترکیب:

ایک دیگچی میں گھی ڈال کر الائچیاں اور لونگ ڈال دیں۔ جب خوش بو آنے لگے تو سویاں ڈال کر ہلکی سی بھون لیں۔ سویاں نکال کر میوہ ڈال دیں اور تل کر نکال لیں۔ دیگچی نیچے اتار کر پانچ منٹ کے لیے ٹھنڈی کرلیں پھر دودھ ڈال دیں۔ دودھ ڈال کر چینی ڈال دیں اور تھوڑی دیر کے لیے پکائیں۔ جب چینی گھل جائے تو سویاں اور تمام تر میوہ ڈال دیں، جب دودھ گاڑھا ہو جائے تو گرم گرم پینے کے لیے پیش کریں۔

(نوٹ: میوہ کاٹنے سے پہلے تینوں چیزوں کو پانچ منٹ کے لیے ابال لیں۔)

سویوں کا زردہ

سامان اور وزن:

سویاں: آدھا کلو — چینی: تین پیالی — بادام: دس عدد (باریک کٹے ہوئے) — پانی: ایک پیالی

پستے: دس عدد (باریک کٹے ہوئے) — چھوٹی الائچی: (ایک چائے کا چمچ چھلکے کے ساتھ پیس لیں) — گھی: چار کھانے کے چمچ

ترکیب:

ایک دیگچی میں گھی ڈال کر گرم کریں۔ جب گرم ہو جائے تو الائچی ڈال دیں۔ خوش بو آنے لگے تو سویاں ڈال کر اچھی طرح بھونیں پھر تھال میں نکال لیں۔ دیگچی میں چینی اور پانی ڈال کر پکالیں۔ شیرا بننے سے پہلے بھنی ہوئی سویاں اور میوہ ڈال کر ہلکی آنچ پر دم لگادیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو ڈش میں نکال کر چاندی کے ورق سجادیں۔

اس آدمی کے سامنے پندرہ کے قریب بچے بیٹھے تھے، وہ سب کے سب خاموش تھے۔ وہ شخص اُن سے کچھ کہنا چاہتا تھا، اسی لیے سب بچوں کی نظریں اس کے لب ہلنے کی منتظر تھیں۔ اُس شخص کے کپڑے اور وضع قطع بہت بہتر تھی لیکن اس کے چہرے پر رنج والم کی کیفیت موجود تھی جو اس کی شخصیت کو عجیب بنا رہی تھی۔ بچوں کے ادب و آداب سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس شخص کو خاصی اہمیت دیتے ہیں۔

"ہاں تو، آپ ہم سے کوئی خاص بات ....!" اچانک ایک لڑکا ہمت کر کے بول پڑا۔ وہ شخص بھی جیسے اچانک نیند سے جاگ پڑا ہو۔ چند لڑکوں کی نگاہیں سوال کرنے والے لڑکے کی جانب اُٹھ گئیں۔ انھیں ڈر تھا کہ وہ شخص کہیں ناراض ہو کر اُسے کچھ کہہ نہ ڈالے۔

"ہاں! میں کیا بات کر رہا تھا......؟" وہ آدمی جیسے بات کرتے کرتے کچھ بھول گیا تھا اس لیے اُس نے بچوں سے ہی سوال کیا۔

"جی...... وہ...... آپ اپنی زندگی...... کی کہانی......" ایک لڑکے نے کچھ ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یاد آیا۔" اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے کہا۔ اس کے مناسب رویے سے لڑکوں کی جان میں جان آگئی۔ ورنہ تو ایسے ہوتا تھا کہ کسی نے اپنی اوقات سے بڑھ کر سوال کیا اور اسے جواب تھپڑ کی صورت میں ملا۔

"معافی چاہتا ہوں اُستاد۔" اچانک ایک اور لڑکا اس محفل میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر فقیروں والا لباس تھا، ہاتھ میں چند نوٹ تھے جو اس نے اس شخص کی جانب بڑھانا چاہے لیکن اُس نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے موجود ٹی وی پر رکھنے کو کہا۔ اس لڑکے نے حکم کی تعمیل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

"تم جاؤ، جلدی کپڑے بدل کر یہیں آجاؤ۔" اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے جانے کو کہا۔

"ٹھیک ہے اُستاد۔" اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد اس شخص نے سامنے رکھے جگ سے پانی کا گلاس بھر کر پینا شروع کر دیا۔ وہ شاید کچھ وقت گزار رہا تھا کہ وہ لڑکا بھی اس کی محفل میں آجائے تو وہ اپنی کہانی شروع کرے۔ کچھ ہی دیر میں وہ لڑکا صاف ستھرے کپڑے پہنے کمرے میں داخل ہوا اور دوسرے لڑکوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ اب وہ شخص جسے بچے اُستاد کہہ رہے تھے، اپنی بات کہنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

"ہاں تو میں تم لوگوں کو اپنی زندگی کی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔" وہ اُداسی سے چھت کو گھورتا ہوا بولا۔ پھر اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر گھومیں

اور بچوں کی جانب مرکوز ہوگئیں۔

''ہم آپ کی کہانی سننے کے لیے بے تاب ہیں۔'' ایک لڑکے نے اچک کر کہا۔

''میں جہاں پیدا ہوا وہاں ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا لیکن ہمارا گھرانہ مزاج کا بہت سخت تھا۔ ہم نرمی کی نعمت سے محروم تھے۔'' وہ پھر مغموم ہو کر ماضی میں کھو گیا۔

''یہ تو واقعی افسوس ناک ہے۔'' ایک لڑکا سادگی سے بولا۔

''بات بات پر غصہ کرنا میرے گھر والوں کی عادت تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مارنا اور سزا دینا، جانے کیوں ان کے مزاج میں شامل تھا۔ میں امی اور ابو کے سخت رویے سے تو پریشان تھا ہی، اوپر سے بڑے بھائی نے میرے جینے کا مقصد فوت کر کے رکھ دیا تھا۔'' یہ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل آئے۔

''اوہ اُستاد!'' نئے آنے والے لڑکے کے منہ سے ہم دردی میں یہ لفظ نکلا۔

''میں پڑھنا چاہتا تھا لیکن بڑا بھائی علم کی دولت سے محروم تھا، اس لیے وہ میری پڑھائی میں بھی رکاوٹ بننے لگا۔ میں ضد کرتا تو اس کے ہاتھ چلتے۔ وہ والد صاحب کی دُکان چلا رہا تھا اور انھیں خوب کما کر دیتا تھا اس لیے وہ اسے کچھ نہیں کہتے تھے۔ وہ مجھ سے بھی یہی چاہتا تھا کہ پڑھائی چھوڑ کر اپنے باپ کا پرچون کا کام سنبھالوں۔'' اُستاد کی کیفیت دیکھنے والی تھی۔

''پھر کیا ہوا اُستاد؟'' ایک لڑکے نفیس نے سوال کیا۔

''میں وہی بتا رہا ہوں۔ مجھے تعلیم چھوڑنا گوارا نہیں تھا۔ بات بے بات بھائی جان نے مار مار کر میرے دل میں اپنے خلاف نفرت پیدا کر دی تھی۔ ماں کی طرف دیکھتا تو وہ بھی اُسے کچھ نہ کہتی۔ والد صاحب کا رویہ تو میں بتا ہی چکا، یوں لگتا تھا جیسے وہ ان ہی کے کہنے پر مجھ پر ظلم توڑ رہا ہو۔ میں آخر ظلم کب تک برداشت کرتا۔

ایک روز......''

''کیا ہوا ایک روز......؟'' اُستاد نے سانس لینے کے لیے خاموشی اختیار کی تو اسلم فوراً بول پڑا۔

''میرے لیے ہر جانب اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور مجھے اُجالے کی تلاش تھی، اس لیے میں نے ایک رات خاموشی سے اپنا گھر چھوڑ دیا۔''

''ارے......'' ارسلان نے اپنا سر کھجاتے ہوئے افسوس سے کہا۔

''میرا خیال تھا کہ میں گھر سے باہر نکل کر اُجالوں کی تلاش میں کام یاب ہو جاؤں گا لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔'' اس نے مزید کہنا شروع کیا۔ ''اپنا شہر چھوڑ کر میں دُور ایک چھوٹے شہر میں آگیا۔ میری عمر کوئی پندرہ برس ہوگی۔ سوچا تو کچھ اور تھا لیکن یہاں تو میرے لیے رہنا اور جینا ہی دُشوار ہوگیا۔ ہر ایک شک کی نظر سے دیکھتا، کوئی مجھے سہارا دینے پر تیار نہ ہوا۔ ہر کوئی ضمانت مانگتا، میں بھلا اجنبی شہر میں کس کا حوالہ دیتا۔''

''ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا تھا۔'' دو تین لڑکوں نے سرگوشی میں بات کی۔

''ایک روز میں پارک میں پُرانی ڈبل روٹی کے ٹکڑے جمع کر کے کھا رہا تھا کہ ایک ہم درد شخص میری جانب آیا۔ اُس نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ ہوٹل لے جا کر خوب پیٹ بھر کر روٹی

کھلائی، پھر سوال و جواب کیے۔"

"کتنا اچھا آدمی تھا وہ......" راحیل نے اُستاد کی طرف دیکھ کر کہا لیکن اُستاد نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

"بہ ظاہر تو وہ شخص بہت اچھا تھا لیکن مجھ پر مہربانی سے پیش آ کر وہ مجھے اپنے ٹھکانے پر لے گیا، جہاں مجھ جیسے بہت سارے لڑکے موجود تھے۔ معصوم بچوں کو بہلا پھسلا کر یہاں لے آنا اور پھر ان سے بھیک منگوانا اس شخص کا کام تھا۔ اس نے مجھے کچھ دن اپنے پاس رکھ کر اس مہم پر لگا دیا۔"

"دیکھو تو اُستاد کی کہانی مجھ سے کتنی ملتی ہے۔" ایک لڑکے نے دوسرے کے کان میں کہا۔

"گھر بار چھوڑ کر میں تو پڑھائی اور اچھے مستقبل کی خاطر نکلا تھا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ باہر نکل کر تو انسان بڑی بڑی مصیبتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مجھے اپنے گھر کے ماضی کے معاملات اب معمولی لگنے لگے تھے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" نفیس نے لقمہ دیا۔

"میرا پڑھنے لکھنے کا خواب اور بڑا آدمی بننے کا عزم بکھر کر رہ گیا۔ میں نے ان لوگوں کی بڑی منت سماجت کی۔ دو تین بار بھاگنے کی کوشش بھی کی لیکن کوئی ترکیب کارگر ثابت نہ ہوئی۔" ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دو لڑکے بھی اُستاد کی کیفیت دیکھ کر اداس ہو گئے۔ اُستاد کے ساتھ رہتے ہوئے ان لڑکوں میں سے کسی کو مہینا اور کسی کو سال ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں اُستاد نے کبھی کسی کو اس طرح ساتھ بٹھا کر بات نہیں کی تھی۔ اُستاد کا رویہ سخت ہوتا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور لڑکوں کو ان کی حد میں رکھتا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ اس سے چوں چاں بھی کر جائیں۔ آج اُستاد کسی خاص وجہ سے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کر رہا تھا۔

"وقت گزرتا رہا۔ میں ان کے ساتھ رہ رہ کر پختہ ہوتا گیا۔ بھیک مانگنے میں جہاں میں شرم کرتا یا ہاتھ نہ پھیلاتا تو ان کے پھیلائے ہوئے ہرکارے جو ہم مانگنے والوں پر نظر رکھتے تھے، فوراً سیدھا کر دیتے۔ آخر کار میں بھیک مانگنے میں ایسا طاق ہو گیا کہ سب سے زیادہ کما کر لانے لگا۔"

"پھر تو وہ بہت خوش ہوئے ہوں گے۔" ایک لڑکے نے سوال کیا۔

"لازمی کی بات ہے، وہ مجھ پر بہت اعتماد کرنے لگے۔ میں سب کچھ بھول بھال کر ان کا ہو کر رہ گیا۔"

اُستاد نے لڑکے کی بات کا جواب دیا۔

"آپ کو کبھی گھر کی یاد نہیں آئی۔" صفدر نے انتہائی معصومیت کے ساتھ کہا۔ اسے تو اپنے ماں باپ روز یاد آتے تھے مگر وہ بھی مجبور تھا۔

"گھر سے پریشان ہو کر بھاگا تھا، اس لیے اس گھر کی جانب سے غافل نئی دنیا میں ایک دم مگن ہو گیا۔"

"کبھی ماں باپ کی یاد آئی......؟"

"ابتدا میں تو ماں بہت یاد آئی لیکن کیا کرتا، اب تو میں یہاں سے نکل بھی نہیں سکتا تھا۔" وہ اُداسی سے بولا۔ "وقت کے ساتھ ساتھ میں بڑا ہوتا گیا اور اپنی فیلڈ کا ماسٹر بھی ہو گیا۔ میرے اُستادوں میں سے دو ایک انتقال کر گئے۔" "پھر......؟"

"مجھے موقع مل گیا تو میں ان سے الگ ہو گیا۔" وہ کچھ خوش سا ہوا۔ "میں نے اپنا کام الگ کر لیا۔" "اچھا......"

"میں بھی مزاروں اور ریلوے اسٹیشن یا دیگر جگہوں پر ایسے بچوں کو تلاش کرتا جو گھر سے بھاگ کر آئے ہوں اور کسی سہارے کی تلاش میں ہوں۔"

اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لکیری آئی اور پھر سنجیدگی میں بدل گئی۔

"میں نے اپنے بھائی کی مار کا بدلہ یوں لیا کہ تم لوگوں کو پیار سے بہلا پھسلا کر یہاں لاتا رہا اور بھیک مانگنے پر لگاتا رہا۔" اب اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اسے شاید اپنے کیے پر پچھتاوا تھا۔

"ایسا کرنا گناہ ہے ناں انکل!" ننھا یاسر جو کچھ دنوں پہلے ہی اس ٹیم کا ممبر بنا تھا، انتہائی معصومیت سے بولا۔ اس کے اس سوال پر اُستاد نے اُسے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"بالکل گناہ ہے میرے بچے! اپنی خوشیاں چھن جانے پر اس کا بدلہ دوسروں سے لینا، دوسروں کے گھروں کے چراغوں کو گل کر دینا، کہاں کی انسانیت ہے۔" اس کے اندر کا انسان جاگ چکا تھا۔ "میں نے اپنی تلخ زندگی سے سبق نہیں سیکھا تھا اس لیے اس دل دل (دلدل) میں اترتا چلا گیا اور اس بات پر مجھے کوئی ندامت بھی نہیں تھی۔" اس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔

"میں نے پچھلے چند ہفتوں میں دو چار ایسے گھرانے دیکھے جہاں بڑے بھائی اپنے چھوٹوں سے بہت پیار سے پیش آتے ہیں۔

(بقیہ حصہ صفحہ نمبر 59 پر ملاحظہ فرمائیں)

دوسرے محلے میں کسی کی شادی تھی اور بڑے زور و شور سے ڈھول بجایا جا رہا تھا۔ خالہ مہر بی بی بڑے شوق سے ڈھول کی آواز سن سن کر خوش ہو رہی تھیں اور محلے کی لڑکیوں کو بلا بلا کر کہہ رہی تھیں: ''ادھر آؤ، ڈھول کی تال پر لڈی ڈالو، جب افضل کی شادی ہو گی تو میں بھی ایسا ہی ڈھول منگواؤں گی تو تم سب لڈی ڈالنا۔''

بچیوں کو بس ایک شغل چاہیے تھا۔ وہ سب خالہ مہر بی بی کے صحن میں اکٹھی ہو کر لڈی اور بھنگڑا ڈالنے لگیں۔ ڈھول کہیں بج رہا تھا، لڈی کہیں ڈالی جا رہی تھی مگر دور سے ڈھول کی آواز بہت اچھی لگ رہی تھی۔

جب مہر بی بی کے بیٹے کی شادی کا موقع آیا تو مہندی کی رسم پر اس نے اپنا چاؤ پورا کرنے کے لئے ڈھول والوں کو بلوا لیا۔ بڑے بڑے ڈھول گلے میں لٹکائے دو ڈھول والے آ موجود ہوئے۔ ڈھول کی گونج دار تھاپ پر پہلے لڑکوں نے پھر لڑکیوں نے خوب لڈی ڈالی، مگر آج بے چاری خالہ مہر بی بی کو اپنے ہاں بجنے والے ان ڈھولوں کی آواز کچھ ایسی خوش گوار نہیں لگ رہی تھی۔ ان کی ''دھم دھما دھم'' کی کرخت اور زور دار گونج سے جیسے دل و دماغ پر ایک چوٹ سی پڑتی محسوس ہوتی۔ اس پر مزے کی بات یہ تھی کہ ڈھول والے شاید دولہا کی ماں کو اپنے فن کے مظاہرے سے زیادہ ہی متاثر کرنا چاہتے تھے کہ وہ بے چاری تقریب میں جہاں بھی جا کر بیٹھتی، ڈھول والے اس کے سر پر جا پہنچتے اور زور و شور سے ڈھول پیٹنا شروع کر دیتے اور بار بار بخشش کا تقاضا بھی کرتے...... ''ویل، نوشے کی ماں کی ویل'' رہ رہ کر پکارتے۔

تقریب کے ختم ہونے تک نہ صرف مہر بی بی، بلکہ اسی کی طرح کی اور بہت سی کم زور دل و دماغ والی بیبیاں سر باندھ کر ادھر اُدھر پڑی کراہ رہی تھیں۔ پورا دن سر کے درد کے مارے تڑپ تڑپ کر گزرا۔ شام تک لاکھ جتن کر کے خالہ مہر بی بی کو کچھ افاقہ ہوا اور وہ بیٹے کی بارات کے ساتھ جانے کے قابل ہوئیں۔ لڑکیوں نے پوچھا: ''خالہ! کیا بارات کے ساتھ ڈھول نہیں جائیں گے؟''

تو خالہ نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''نا بابا! ڈھول بس دُور ہی کے سہانے!''

☆☆

پھل دار درخت

فرزانہ چیمہ

بہت سال گزرے، ایک بستی میں ایک لکڑہارا رہتا تھا جو بہت نیک اور صابر و شاکر تھا۔ اس کا معمول تھا کہ صبح سویرے اذان کی آواز پر اُٹھ جاتا۔ وضو کر کے مسجد کو چل دیتا جہاں نماز ادا کر کے کچھ دیر کے لیے قاری صاحب سے قرآن پاک پڑھتا، پھر اس کا ترجمہ پڑھنے کی کوشش کرتا۔ کوئی گھنٹے بھر کے بعد جب مسجد سے گھر آتا تو اس کی بیوی اس کا ناشتا تیار کر چکی ہوتی۔ ناشتا کیا ہوتا، بس دو پراٹھے اچار کے ساتھ اور قریبی جنگل کی طرف نکل کھڑا ہوتا، جہاں خوب لکڑیاں کاٹ کاٹ کر جب تھک جاتا تو پھر کسی درخت کے سائے میں آ بیٹھتا۔ قریب ہی ندی کا صاف شفاف پانی بہہ رہا ہوتا۔ لکڑہارا آرام سے اپنا ناشتا کھول کر رومال زمین پر بچھا دیتا اور نہایت مزے سے ناشتا کرتا، پھر اللہ کا شکر ادا کر کے ذرا دیر کو سستا لیتا۔ کچھ دیر کے بعد جنگل میں گھوم پھر کر جنگلی پھل اور میوے اکٹھے کرتا۔ دوپہر ہونے سے پہلے پہلے واپس آ کر لکڑیاں بازار میں فروخت کر کے گھر آ جاتا۔ گھر آ کر سارے پیسے اپنی بیوی کو تھما دیتا اور میوے بچوں کو دے دیتا۔ وہ اپنا شام کا وقت بستی کے لوگوں کے دکھ سکھ میں گزار دیتا، ساتھ ہی ساتھ مسجد میں نمازیں بھی ادا کرتا رہتا۔

بستی کے سارے بڑے بوڑھے عبداللہ لکڑہارے کی بہت عزت کرتے۔ اس سے محبت کرتے تھے کیوں کہ وہ ہر کسی کے کام آیا کرتا تھا۔ وہ بات بھی کھری اور صاف صاف کرتا۔ جھوٹ کے قریب بھی نہ پھٹکتا۔ اس کا اس بات پر پختہ یقین تھا کہ جھوٹ بولنے سے گھر سے رحمت اور برکت دونوں اُٹھ جاتی ہیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ لکڑہارا جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ اس نے کہیں سے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور پوری توجہ سے اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا۔ آواز کسی بچے کی معلوم ہو رہی تھی جو سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ عبداللہ رحم دل تو تھا ہی، فوراً کام چھوڑ کر بچے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ جھاڑیوں اور درختوں کو غور سے دیکھتا ہوا آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ تھوڑی ہی دور اس نے جھاڑیوں کے قریب ایک بڑے سے درخت کے پیچھے دیکھا تو ایک بچہ تھا جو آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ درخت سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ شاید روتے روتے تھک کر نڈھال ہو گیا تھا۔ عبداللہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس قدر خوب صورت اور پیارا بچہ اس نے ساری بستی میں نہیں دیکھا تھا۔ "سبحان اللہ!" اس کے دل نے بے اختیار اپنے رب کی تعریف کی، جس نے اس بچے کو ایسی پیاری صورت سے نواز رکھا تھا۔

عبداللہ اس کے قریب گیا۔ گھاس پہ چلتے ہوئے جب سوکھے پتوں سے چر چر کی آواز نکلی تو بچے کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے عبداللہ کو دیکھنے لگا۔

لکڑہارے نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو بچہ اس سے لپٹ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنی خالہ کے گھر جا رہا تھا جو جنگل کے دوسری طرف ایک گاؤں میں رہتی ہے۔ نجانے کس طرح وہ جنگل میں راستہ بھول کر ماں سے بچھڑ گیا اور اسے تلاش کرتے کرتے تھک کر اب یہاں بیٹھا اپنی بے بسی اور بے چارگی پہ آنسو بہا رہا تھا۔ وہ عبداللہ کے ساتھ اس کے گھر چلنے کو تیار ہوگیا۔ گھر آ کر وہ عبداللہ کے بچوں میں گھل مل گیا۔ عبداللہ کی بیوی بھی بہت نیک فطرت عورت تھی، اس نے بھی بچے کو خوب پیار کیا۔ یہ سوچ کر اس کا دل بھی پریشان ہوگیا کہ نجانے کس ماں کا بیٹا اس سے بچھڑ گیا ہے۔ یوں پیار محبت کی چھاؤں میں وہ پلنے لگا۔ بچے نے اپنا نام شان بتایا۔ وہ تھا بھی بڑی آن بان اور شان والا۔ چند ہی روز میں سب گھر والوں نے محسوس کیا کہ شان اچھی عادتوں کا مالک نہیں ہے۔ وہ اپنی شکل وصورت پر ناز کرتا، غریبوں سے دُور بھاگتا اور امیر بچوں کی خوشامد کرتا، جب کہ عبداللہ کے بچے اس سے مختلف تھے۔ وہ شکل وصورت کے لحاظ سے تو عام سے بچے تھے لیکن اچھے اخلاق اور اعلیٰ اوصاف کے مالک تھے۔ عبداللہ جب بھی شام کے وقت بستی کے بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتا تو شان کی کسی نہ کسی بُری عادت کے باعث اسے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

ایک روز تو حد ہی ہوگئی۔ بستی کا ایک لڑکا بوٹا روتا ہوا عبداللہ کے پاس آیا اور بتایا کہ شان اسے اپنے ساتھ کھیلنے نہیں دیتا حالاں کہ بوٹے نے کھیل میں کبھی بے ایمانی نہیں کی، کسی کو الٹے سیدھے نام سے بھی نہیں پکارا۔

عبداللہ فوراً اس کے ساتھ جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور اسے پیار کرتے ہوئے دلاسا دیا کہ میں شان سے جا کر بات کرتا ہوں، وہ تمہیں ضرور کھلائے گا۔ شان سے جب بات ہوئی تو اس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

''ابا! میں اسے ہرگز نہیں کھیلنے دوں گا۔ دیکھتے نہیں اس کا رنگ کتنا کالا ہے بالکل اس جیسا۔'' اس نے درخت پر بیٹھے کوے کی طرف اشارہ کیا تو دوسرے لڑکے ہنس پڑے۔

''شان پتر! ایسا تو نہ کہو۔ یہ رنگ و روپ تو اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں۔ اس پر کسی انسان کا کیا اختیار ہے۔'' لکڑہارا دل ہی دل میں کانپ اُٹھا۔ شان بوٹے کی طرف دیکھ کر اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے بولا۔ ''ابا! جس کی سفارش لے کر تو آیا ہے ناں، یہ اندر سے بڑا کھوٹا ہے۔ ہر ایک سے نمبر بنانے کی خاطر ملتا ہے اور ایسے ظاہر کرتا ہے کہ جیسے اسے سب سے عزیز وہی ہے۔'' شان نے ایک نفرت بھری نگاہ اس پہ ڈالی۔

''یہ تو اس کا اعلیٰ اخلاق ہے، بھئی!'' عبداللہ نے پیار سے بوٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ عبداللہ جانتا تھا کہ بوٹا پانچ وقت کا نمازی ہے، وہ اسے اکثر مسجد میں نظر آتا رہتا تھا۔

''اخلاق......؟ وہ بھی اعلیٰ اور اس کالے کلوٹے کا؟'' شان نے بڑے غرور سے بیٹ کو ہوا میں لہراتے ہوئے بوٹے کو دیکھا جو سہم کر عبداللہ کے پیچھے ہوگیا۔ شاید اسے لگا کہ شان اسے بیٹ مارنے لگا ہے۔ بوٹے کی اس بے اختیار گھبراہٹ پر شان کو بہت لطف آیا اور اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

عبداللہ خاموشی سے گھر لوٹ آیا۔ ''کاش میں مجھے پتا ہوتا کہ یہ اتنا مغرور اور بد دماغ ہے تو میں کبھی گھر نہ لاتا۔'' وہ سوچوں میں ڈوبا ہوا، چپ چاپ مسجد کی طرف چل دیا کہ مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔

بوٹا بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلتا ہوا آ رہا تھا، بجھے دل اور بوجھل قدموں سے۔ عبداللہ نے مسجد کے قریب جا کر بوٹے کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

''بوٹے پتر! تو دل میلا نہ کر، میں کل جنگل سے تیرے لیے لکڑی کی تلواریں بنا کر لاؤں گا، پھر تم میرے بچوں سے کھیلا کرنا اور شان کے لیے بھی دعا کرنا۔ میں بھی دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ اس میں عاجزی پیدا کر دے۔ اس کے اخلاق بھی اچھے کر دے۔ پتر! انسان اعلیٰ اخلاق اور اچھے اعمال سے بڑا بنتا ہے، رنگ پر فخر سے نہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ جتنا کوئی جھکتا ہے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ اسے عزت دیتا ہے۔'' عبداللہ نے بوٹے کے شانے تھپتھپاتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔

بوٹا اپنا سارا دکھ بھول کر تلواروں کے شوق میں جلدی سے مسجد کے اندر بھاگ گیا۔ عبداللہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا اور دعا کرتا رہا۔ کاش!
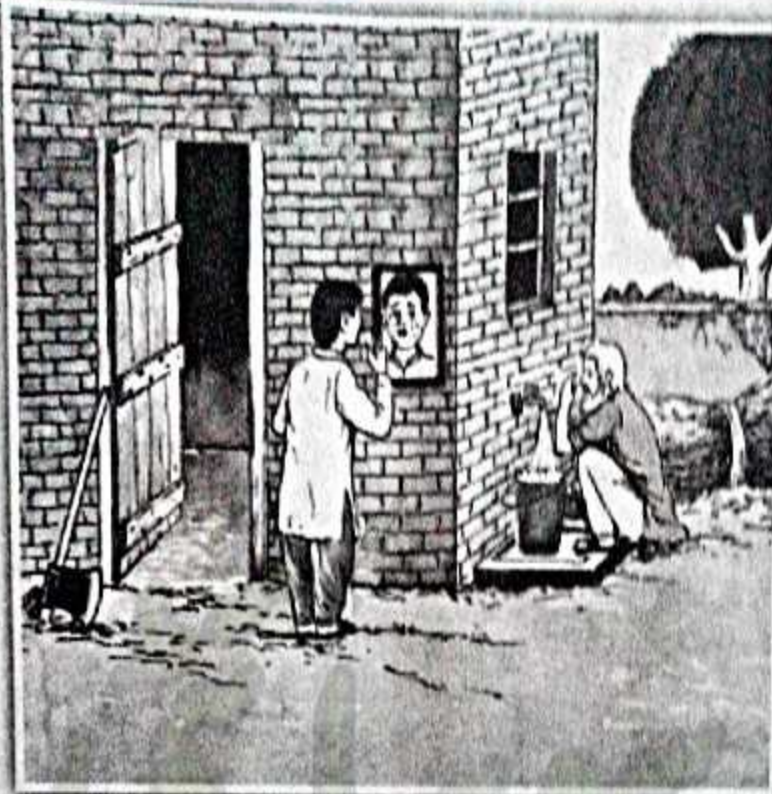
شان بھی اسی طرح نمازی بن جائے، اسی طرح پیار اور محبت کرنے والا اور بڑوں کا ادب کرنے والا بن جائے۔

اس بات کو سات آٹھ دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک دن اچانک شان کو خارش شروع ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا، بستی کے دوسرے بچوں نے اس کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیا بلکہ جیسے ہی وہ کھیلنے کے لیے گھر سے باہر نکلتا، لڑکے اس سے دور بھاگ جاتے اور کہتے جاتے۔ ''بھاگو! بھاگو! خارشی آ گیا، خارشی آ گیا۔'' شان دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا مگر کچھ کر نہ سکتا۔

عبداللہ نے گاؤں کے حکیم صاحب سے اس کا علاج تو کروایا مگر خاص افاقہ نہ ہوا۔ خارش کی وجہ سے اس کے تمام دوست اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ البتہ ایک بوٹا تھا جو روزانہ عصر کی نماز پڑھ کر اس کے گھر آتا اور اس کے ساتھ مغرب کی نماز تک وقت گزارتا۔ اسے تسلی دیتا اور اس کے لیے دعا کرتا اور شان دل ہی دل میں شرم سار تھا۔

اس دن جمعہ تھا، عبداللہ اور اس کے بچے نہا دھو کر جمعہ پڑھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ عبداللہ کی بیوی نے شان کو بھی نہانے کا کہا اور اس کے کپڑے غسل خانے میں رکھ آئی۔ شان نے نہا کر کپڑے بدلے اور کنگھی کرنے کے لیے جب شیشے کے سامنے کھڑا ہوا تو شیشے پہ نظر پڑتے ہی اس کی ایک چیخ سی نکل گئی۔ یہ وہ شان تو نہ تھا۔ اس کا چہرہ عجیب وحشت زدہ سا لگ رہا تھا۔ خارش کرنے سے اس کے چہرے پر جگہ جگہ دانے نکل آئے تھے اور خراشیں بھی پڑ گئی تھیں۔

عبداللہ جو وضو کرتے ہوئے اس کو بھی دیکھتا جا رہا تھا اور اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اب جو اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے تو پاس آ کر محبت سے بولا۔ ''شان پتر! بوٹا یاد آ رہا ہے ناں......؟ تم نے اس کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ اب تمہیں احساس ہو ہی گیا ہے تو پھر آؤ مسجد چلتے ہیں، نماز جمعہ ادا کرو۔ اپنے رب سے اپنے غرور اور تکبر کے لیے توبہ کرو اور بوٹے سے بھی گلے ملو۔ مجھے اپنے اللہ کی رحمت پر پورا بھروسا ہے، وہ تمہیں خارش سے نجات ضرور دے گا۔ حکیم صاحب کہہ رہے تھے کہ دوا اور دارو تو میں کر رہا ہوں مگر آپ لوگ دعا بھی کریں۔ اللہ پاک رحمت کر دیں گے۔'' عبداللہ پیار سے آہستہ آہستہ بولتا رہا، شان بے قراری سے عبداللہ کے گلے لگ گیا۔

''ابا! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تیرا دل دکھایا ہے۔ اور بوٹا......! اس نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اللہ مجھے اس مرض سے آرام دے دے تو پھر دیکھئے گا کہ میں ایک نیا انسان بن جاؤں گا اور ہاں! آج میں بھی جمعہ پڑھنے جاؤں گا۔ آج کے بعد تو مجھے نمازی ہی دیکھے گا، اللہ کے فضل سے۔'' شان نے ایک عزم سے وعدہ کیا۔

عبداللہ خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بولا۔ ''شان پتر! سیانے کہتے ہیں کہ پھل دار شاخ ہمیشہ جھکی ہوتی ہے جب کہ ٹنڈ منڈ شاخ اکڑی رہتی ہے۔ تم پھل دار شاخ بنو بیٹا! جو جھکی ہی رہتی ہے، دوسروں کو پھل بھی دیتی ہے اور فائدہ پہنچاتی ہے۔''

؎ جو عالی ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کر ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

پرانے زمانے کی بات ہے، ملک شام کے ایک شہر حمص میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ اس کا ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام حاکم تھا۔ سوداگر نے دن رات محنت کر کے پائی پائی جمع کی تھی اور اب اس کا شمار حمص کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس پر بھی وہ بہت سادہ زندگی بسر کرتا اور حاکم کو بھی حد سے زیادہ بڑھنے نہیں دیتا تھا۔

جب سوداگر کا انتقال ہوا تو اس کی ساری جائیداد حاکم کو ملی۔ اتنی دولت پا کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور وہ اپنے باپ کی خون پسینے کی کمائی دونوں ہاتھوں سے لٹانے لگا۔ اس کی حویلی میں دن رات خوشامدی دوستوں کا مجمع لگا رہتا۔ روز شہر کے کسی نہ کسی امیر آدمی یا سرکاری افسر کی دعوت ہوتی جس پر وہ دل کھول کر پیسہ خرچ کرتا۔ آہستہ آہستہ سارا جمع جتھا ختم ہونے لگا اور ایک دن وہ بھی آیا جب اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ رہی۔

جب اس کے دروازے پر فاقوں نے دستک دی تو اس نے جائیداد بیچنی شروع کر دی لیکن لچھن وہی رہے۔ فضول خرچی میں کمی نہ کی۔ چناں چہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ دھیرے دھیرے تمام جائیداد بک گئی اور وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ دو تین فاقے کیے تو نانی یاد آ گئی۔ سوچا کوئی کام کروں اور کسی طرح پیٹ کا دوزخ بھروں لیکن کام کوئی آتا نہ تھا۔ ناچار منہ پر کپڑا لپیٹ کر منڈی میں گیا کہ مزدوری ہی کر لوں لیکن وہاں پہلے ہی مزدوروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اسے کسی نے کام نہ دیا۔

حیران پریشان در بہ در، خاک بہ سر پھر رہا تھا کہ ایک بوڑھے آدمی پر نظر پڑی جو بڑا قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا۔ غور سے دیکھا تو شکل جانی پہچانی سی لگی۔ قریب گیا تو خوشی سے اُچھل پڑا۔ یہ اس کا رشتے کا چچا شیخ عبدالحمید تھا جو تجارت کے سلسلے میں عموماً شہر سے باہر رہتا تھا اور برسوں میں ایک آدھ بار ہی اس کے گھر آتا تھا۔

حاکم دوڑتا ہوا شیخ کے پاس گیا اور بڑے ادب سے اسے سلام کیا۔ بوڑھے شیخ نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور تعجب سے بولا: "ارے حاکم! تم؟ مگر تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

حاکم نے چچا کو اپنی دُکھ بھری کہانی سنائی اور پھر سر جھکا کر بولا: "افسوس! مجھ سے زیادہ بدنصیب انسان دُنیا میں کوئی نہ ہوگا۔"

شیخ عبدالحمید چپ چاپ حاکم کی بپتا سنتا رہا اور جب وہ خاموش ہوا تو بولا: "خیر، جو ہوا سو ہوا۔ گزشت را صلوٰۃ، آئندہ را احتیاط۔ اب تم میرے ساتھ چلو اور کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ اگر تم نے محنت و دیانت سے کام کیا، بُری صحبت میں نہ پڑے، شریفوں کی طرح رہے

تو دُنیا کا کوئی دکھ تمہارے پاس تک نہ پھٹک سکے گا۔"

اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ حاکم راضی ہو گیا اور شیخ عبدالحمید اسے اپنے گھر لے گیا۔ گھر کیا تھا، پورا محل تھا جس میں بیس پچیس کمرے، بڑے بڑے دالان اور آگے پیچھے پھل دار درختوں کے خوش نما باغ تھے۔ انہی دالانوں اور غلام گردشوں سے گزرتا ہوا وہ ایک دالان میں پہنچا تو حیرت نے اس کے پیر پکڑ لیے۔ بھونچکا سا کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس دالان میں چار بوڑھے ایک دائرے میں سر جھکائے بیٹھے بین کر رہے تھے۔ وقفے وقفے سے سر اٹھا کر ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھرتے اور پھر سر جھکا کر رونے لگتے۔ شیخ عبدالحمید نے ان بوڑھوں کی طرف افسردہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر خود بھی انہی کی طرح آہ بھر کے حاکم سے بولا:

"تم میری اور ان بوڑھوں کی دیکھ بھال کرو گے۔ ضرورت کی ہر چیز ہمیں وقت پر ملتی رہے۔ ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو لیکن ایک بات کا سختی سے خیال رکھنا۔ کبھی بھول کر بھی یہ نہ پوچھنا کہ ہم آہ و زاری کیوں کرتے ہیں۔ بولو وعدہ کرتے ہو؟" حاکم نے وعدہ کر لیا، حال آں کہ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ یہ بوڑھے جنھیں دُنیا کی ہر چیز میسر ہے، اتنے دُکھی کیوں ہیں!

دن گزرتے رہے، بوڑھے روتے رہے اور حاکم ان کی خدمت کرتا رہا۔ شیخ عبدالحمید اس سے بہت خوش تھا۔ اس نے وصیت کر دی تھی کہ اس کے بعد اس کی ساری جائیداد کا وارث حاکم ہو گا۔

دو سال اسی طرح بیت گئے۔ بوڑھے اب بہت کم زور ہو گئے تھے اور ان کے چل چلاؤ کا وقت آ گیا تھا۔ ایک دن صبح کو حاکم سو کر اُٹھا تو معلوم ہوا کہ ایک بوڑھا اس دُنیا سے کوچ کر گیا ہے۔ ایک ہفتے بعد دوسرا بوڑھا بھی چل بسا اور دس پندرہ دن بعد باقی دونوں بوڑھے بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اب حویلی میں صرف حاکم اور شیخ عبدالحمید رہ گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد شیخ بھی بیمار ہو گیا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ یہ دیکھ کر حاکم نے اس سے کہا: "چچا جان، میں نے اب تک آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ کبھی یہ نہ پوچھا کہ آپ اور آپ کے ساتھی اتنے اداس اور غم گین کیوں رہتے ہیں لیکن اب آپ کا آخری وقت آ گیا ہے۔ خدارا اب تو بتا دیجیے کہ آپ لوگ اتنے دکھی کیوں تھے؟"

شیخ عبدالحمید آہ بھر کر بولا: "بیٹا، تمھیں یہ بات نہیں پوچھنی چاہیے تھی لیکن ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اداسی کا سبب بتا دوں تو تم اس دکھ درد سے محفوظ رہو جس میں ہم ساری زندگی مبتلا رہے۔ اتنا کہہ کر شیخ ذرا سا اُٹھا، گاؤ تکیے سے کمر ٹیکی اور پھر سامنے ایک بھاری بند دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا: "یہ دروازہ کبھی مت کھولنا۔ اگر تم نے میری نصیحت نہ مانی تو تمہارا بھی وہی حال ہو گا جو ہمارا ہوا۔" یہ کہہ کر شیخ نے زور کی ہچکی لی اور پھر اپنی جان، جان پیدا کرنے والے کے سپرد کر دی۔

شیخ عبدالحمید کی وفات کے بعد اس کی جائیداد کا وارث حاکم بنا اور وہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگا۔

ایک دن حاکم اس دروازے کے پاس سے گزرا جسے شیخ عبدالحمید نے کھولنے سے منع کیا تھا۔ اسے اپنے چچا کے وہ الفاظ یاد تھے جو اس نے مرتے وقت کہے تھے لیکن وہ اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے سوچا، دیکھوں تو اس دروازے کے اندر ایسی کیا چیز ہے جسے دیکھنے سے اس کے چچا نے منع کیا تھا۔ اس کے دماغ نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا اور دروازہ کھول کر اندر نظر ڈالی۔

دروازے کے ساتھ پتھر کی سیڑھیاں تھیں جو ایک لمبی سی سرنگ میں جاتی تھیں۔ اس سرنگ کے آخری سرے پر مدھم مدھم سی روشنی ٹم ٹما رہی تھی۔ حاکم کے پاؤں بے اختیار سیڑھیاں طے کرنے لگے۔ اب وہ سرنگ کے اندر اس روشنی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آخر کار چلتے چلتے وہ سرنگ کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ یہ سرنگ ایک لمبے چوڑے میدان میں نکلتی تھی۔ وہ اس لق و دق میدان میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ سامنے سے اونٹوں کا ایک قافلہ آتا دکھائی دیا۔ یہ چار اونٹ تھے۔ تین اونٹوں پر تین آدمی سوار تھے اور چوتھا خالی تھا۔

اونٹ قریب آئے تو حاکم کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جن سواروں کو وہ مرد سمجھ رہا تھا وہ عورتیں تھیں جو شکل سے پرستان کی پریاں یا جنت کی حوریں لگ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک عورت نیچے اُتری، اس نے خالی اونٹ پر حاکم کو بٹھایا اور پھر یہ قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے عورتوں سے بہتیرا پوچھا کہ وہ اسے کہاں لیے جا رہی ہیں لیکن وہ مسکراتی رہیں۔ بولیں کچھ نہیں۔

چند گھنٹوں کے سفر کے بعد یہ قافلہ ایک نہایت خوب صورت اور صاف ستھرے شہر میں پہنچا۔ یہاں ہر طرف چہل پہل تھی۔ لوگ باگ اپنے اپنے کام کاج میں مشغول تھے۔ ہر شخص کے چہرے پر

مسکراہٹ تھی اور ہر شخص مطمئن اور خوش حال نظر آتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ قافلہ ایک عالی شان محل کے دروازے پر جا کر رُک گیا۔ تینوں عورتیں اونٹوں پر سے اُتریں اور حاکم کو محل کے اندر لے گئیں۔ وہ محل کی ایک ایک چیز کو دیکھتا اور حیرت سے دانتوں تلے انگلیاں دبا لیتا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی سہانا سپنا دیکھ رہا ہو۔

عورتیں خوب صورت باغات، پھولوں کے حسین و جمیل تختوں اور ان کے درمیان چلتے ہوئے خوش نما فواروں کے پاس سے گزرتی ہوئی حاکم کو ایک بڑے سے کمرے میں لے گئیں، جہاں ایک بڑے سے سونے کے تخت پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس نے حاکم سے کہا:

''ہم تمہیں اپنی سلطنت میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ یہاں ہم عورتوں کی حکومت ہے اور ہم نے اسے جنت بنا دیا ہے۔ یہاں نہ کوئی چوری کرتا ہے، نہ ڈاکا ڈالتا ہے۔ ہر شخص کو ضرورت کی ہر چیز مہیا کی جاتی ہے۔ کوئی غریب نہیں ہے۔ کوئی کسی کا محتاج نہیں ہے۔ سب خوش و خرم زندگی بسر کرتے ہیں۔ بولو! ہماری سلطنت میں رہنا چاہتے ہو؟''

''اس جنت میں کس کا دل رہنے کو نہیں چاہے گا، ملکۂ عالیہ!'' حاکم نے بڑے ادب سے سر جھکا کر کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔'' ملکہ نے کہا۔ ''تم یہیں ہمارے محل میں رہو لیکن ایک بات یاد رکھنا۔'' یہ کہہ کر ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کیا اور پھر بولی: ''یہ دروازہ مت کھولنا۔ ورنہ ساری عمر پچھتاؤ گے۔''

حاکم کو عورتوں کی اس سلطنت میں رہتے ایک برس ہو گیا تھا۔ اس عرصے میں اس نے وزیر زادی کی لڑکی سے شادی کر لی تھی اور اب وہ ایک چاند سے بیٹے کا باپ تھا۔ اس کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات تھی۔ فکر تھی نہ کوئی غم۔ بس ایک چیز دل میں کھٹکتی رہتی تھی۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس دروازے کے اندر کیا ہے جسے کھولنے سے ملکہ نے منع کیا تھا۔

ایک دن اس دروازے کے پاس سے گزرا تو ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ میں نے اپنے چچا کا کہنا نہ مانا تو اس جنت میں پہنچ گیا۔ اگر میں ملکہ کا کہنا نہ مانوں تو ہو سکتا ہے ایسی جنت میں پہنچ جاؤں جو اس سے بھی اچھی ہو۔ یہ سوچ کر اس نے دروازے کا کنڈا پکڑ کر کھینچا۔ دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھل گیا۔ اس دروازے کی سیڑھیاں بھی ایک لمبی سی سرنگ میں جاتی تھیں اور اس سرنگ کے آخری سرے پر بھی مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر سرنگ کے آخری سرے تک گیا اور جب باہر نکلا تو سرنگ ایک دم غائب ہو گئی۔ اب وہ ایک میدان میں کھڑا تھا۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ہر چیز جانی پہچانی نظر آئی۔ وہ اپنے شہر حمص میں پہنچ گیا تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ وہ بوڑھے کیوں ہر وقت روتے پیٹتے رہتے تھے۔ اب اس کی زندگی بھی روتے دھوتے ہی گزرے گی۔ وہ اپنے اس گھر بار اور بیوی بچوں کو یاد کرتا جو اس جنت میں چھوڑ آیا تھا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔ اسی طرح روتے دھوتے ایک دن وہ مر گیا اور اس دروازے کا راز بھی اپنے ساتھ ہی قبر میں لے گیا۔

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

فرقان ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ حساب کتاب میں بھی بہت تیز تھا۔ اس کے چچا جان لاہور کے ایک معروف بازار میں کاروبار کرتے تھے۔ فرقان اکثر اوقات لاہور آیا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ ملازمت کی تلاش میں تھا۔ اس بار وہ لاہور آیا تو اپنے چچا جان کے شوروم میں بھی گیا۔ چچا جان اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ فرقان سلام دعا کے بعد ایک طرف بیٹھ گیا۔ چچا جان شوروم میں اکاؤنٹنٹ کے لیے انٹرویو کر رہے تھے۔ چچا جان نے ایک امیدوار سے سوال کیا:

اگر 3 سیلزمین 3 چولہے 7 منٹ میں بیچ سکتے ہیں تو 6 سیلزمین 70 منٹ میں کتنے چولہے بیچیں گے؟

امیدوار سوچ میں پڑ گیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن فرقان نے چند سیکنڈ سوچنے کے بعد جھٹ سے جواب دے دیا۔

پیارے بچو! فرقان نے کیا جواب دیا؟ آپ بھی تھوڑا سا سوچیے اور جواب لکھ کر بھیجیے۔

جون 2014ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے" کا صحیح جواب یہ ہے:

ایمن نے برف کے ٹکڑے پر دھاگہ رکھا اور انگلی سے دبایا۔ انگلی کے دباؤ سے دھاگے نے برف کے ٹکڑے پر جگہ بنالی اور دھاگہ برف سے چپک گیا۔ یوں ایمن نے برف کے ٹکڑے سے دھاگہ باندھے بغیر ٹکڑے کو باہر نکال لیا۔

جون 2014ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1۔ عبداللہ طاہر، گوجرانوالہ
2۔ اسامہ امین، فیصل آباد
3۔ سید محمد علی حسن، لاہور
4۔ فتح محمد شارق، خوشاب
5۔ محمد علیان، سرگودھا

میری بیاض

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

(مریم صدیقہ راجپوت، گوجرانوالہ)

سب فنا ہو جائیں گے کاتیؔ ولیکن حشر تک
نعتِ حضرتؐ کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

(محمد اسد عبداللہ قادری، کاموکی)

چلتا رہا جو آبلہ پائی کے باوجود
منزل کا مستحق وہی صحرا نورد ہے

(شیزہ جاوید، گوجرانوالہ)

زاہد طواف یار سے مجھ کو کہاں ہے فرصت
کعبے کو جاتے ہیں وہی جن کا حرم نہیں

(محمد عمر عطا قادری، کاموکی)

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب مُلّا و جمادات و نباتات

(حنا مشتاق، گجرات)

یہ پیام دے گئی مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

(عبدالرحمٰن، راولپنڈی)

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک میرا
آسمان چیر گیا نالۂ بے باک میرا

(سید شہریار، لاہور)

ایسا کوئی نہیں جو کہے میں ہوں خود خراب
ہر شخص کہہ رہا ہے زمانہ خراب ہے

(حرا سعید شاہ، جوہر آباد)

میں شکستہ ہو گیا ہوں وقت تیرے ہاتھ سے
میرا ساتھ چھوڑ دے یا کھل کر میرا ساتھ دے

(محمد حنظلہ سعید، فیصل آباد)

درود لکھتی ہوں پیہم سلام لکھتی ہوں
ہر ایک نبی کا رسول و امام لکھتی ہوں
کسی کو بھی کسی قیمت پہ بھی نہ دوں گی کبھی
جس قلم سے میں محمد ﷺ کا نام لکھتی ہوں

(نجیبہ شاہین، بہاول پور)

یہ اختیار آنکھوں کا ہے یہ فیصلہ ہے دل کے پاس
سعدیؔ و حافظؔ بھی ہیں مسند نشینان کے پاس
کیا خضر اور کیا راہبر حیران ہیں اس بات پر
کیوں خوش نشیں ہے قافلہ اک راندۂ منزل کے پاس

(ام کلثوم، ملتان)

مزاج ہم سے زیادہ جدا نہ تھا اس کا
جب اپنے طور یہی تھے تو کیا گلہ اس کا
وہ اپنے زعم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
اسے گماں بھی نہیں میں نہیں رہا اس کا

(جاوید عثمان، سیال کوٹ)

اے دل نہ بنا غیر کو محرم اپنا
ہر زخم پہ آپ رکھ تو مرہم اپنا
تنہائی میں آپ اپنے دکھ درد کو جھیل
اپنے کو بنا آپ ہی ہمدم اپنا

(عمران تنویر، گجرات)

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب ابھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

(سائرہ بتول، ساہی وال)

(شاہ بہرام انصاری، ملتان)

''لو بھئی! رمضان المبارک کے روزے پورے ہوئے اور عید کی خوشی میں آپ کے لیے زبردست خوش خبری! اس ماہ آپ سب کو ڈبل تنخواہ دی جائے گی۔'' بزنس مین ارسلان میٹنگ ختم ہونے کے بعد کرسی سے اٹھتے ہوئے اعلان کر رہے تھے۔ ''شکریہ سر!'' بیک وقت کئی آوازیں سننے کو ملیں۔ ''اچھا خالد صاحب! اب میں چلتا ہوں، میری ایک ضروری میٹنگ ہے۔'' ارسلان سراج یہ کہہ کر بجلی کی سی تیزی سے لفٹ میں سوار ہو گئے۔ خالد ان سے ضروری بات کرنا چاہ رہے تھے لیکن ان کے پاس اتنا وقت کہاں تھا۔ اپنے سٹاف کو ایسی خوش خبریاں وہ اکثر و بیشتر سناتے رہتے تھے اور ان کے کانوں کو بھی ہر مہینے کسی نہ کسی بونس آفر سننے کی عادت ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود ایک بات ان سب کو اداس کیے رکھتی۔

عیدالفطر قریب آئی تو بازار سحری تک کھلے رہتے۔ لوگ جوق در جوق خریداری کر رہے تھے۔ دکان داروں کی ''اسپیشل عید ڈسکاؤنٹ لسٹ'' میں مختلف چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ غریب لوگ اشیاء کی قیمتیں جان کر الٹے پاؤں لوٹ آتے۔

ارسلان کی کمپنی دیدہ زیب گارمنٹس کے حوالے سے ملک گیر شہرت رکھتی تھی۔ ارسلان ایک غیر ذمہ دار شخص تھے۔ وہ اپنی کمپنی کے برائے نام مالک تھے ورنہ سارے معاملات اور لین دین ان کے منیجر خالد کرتے تھے۔ خالد صاحب ایک منجھے ہوئے اور تجربہ کار شخص تھے۔ ارسلان کو ان پر مکمل بھروسا تھا، اس لیے تمام اہم کام ان کو سونپے ہوئے تھے۔ اپنی کمپنی کے تمام ڈیزائنرز کے ساتھ ارسلان کا رویہ بہت دوستانہ تھا مگر انہیں غریبوں سے سخت نفرت تھی۔ کمپنی کے تمام لوگ ارسلان کی بہت عزت کرتے تھے لیکن ان کی یہ خصلت اور بُرائی تمام خوبیوں پر حاوی ہو جاتی۔ معروف کمپنی ہونے کی وجہ سے ان کے در پر کوئی نہ کوئی سوالی آس لگائے بیٹھا ہوتا۔

ارسلان کی کمپنی خوب ترقی کر رہی تھی۔ کمپنی کے سب لوگ جب ارسلان کا غریبوں سے ہتک آمیز رویہ دیکھتے تو انہیں بے حد افسوس ہوتا۔ وہ نوکری سے نکالے جانے اور ارسلان کی ناراضگی کے ڈر سے چپ رہنے میں اپنی عافیت جانتے۔ خالد صاحب بھی ان کے ساتھ بات کرنے سے کتراتے تھے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ ارسلان سے ایسی بات کہہ سکے۔

کچھ عرصہ بعد ان کی کمپنی میں ایک نیا لڑکا کامران آیا۔ وہ نہایت محنتی اور ذہین تھا۔ اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ان کے افسر بالا غریب افراد سے کھنچے رہتے ہیں۔

ایک روز ایک بوڑھے فقیر نے ارسلان سے کچھ مانگا تو وہ آگ بگولہ ہو گئے اور اس کو بُرا بھلا کہہ کر آفس سے باہر نکلوا دیا۔ کامران کو بہت دکھ ہوا۔ اس نے اس سلسلے میں ارسلان سے بات کرنے کا سوچا اور مناسب موقع پر اس نے ارسلان کو ہمت کر کے سمجھایا اور کہا: ''جناب آپ ہم پر جو اضافی اخراجات کرتے ہیں، براہ مہربانی آپ یہ رقم ناداروں میں تقسیم کر دیا کریں۔ اس سے ان کے مالی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ہم ان بے آسراؤں کو یوں لاچار اور ذلیل ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔'' کمپنی کے تمام ملازمین نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ارسلان کو احساس ہو گیا تھا۔ اگلے پل میں اس نے ایک ارادہ کر لیا اور اپنے اردگرد رہنے والے غریب گھرانوں کو انہوں نے خوب صورت کپڑے تحفتاً پیش کیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے وہ رقم بھی دے دی جو آج لنچ کے لیے مخصوص تھی۔ وہ سب لوگ حیران بھی تھے اور ممنون بھی کہ ارسلان میں اتنی بڑی تبدیلی اچانک کیسے آ گئی۔ اس کا جواب تو صرف ارسلان کو پتا تھا جس نے جان لیا تھا کہ دلی سکون تو صرف خلقِ خدا کی خدمت میں ہے۔ ساجھے دکھ سکھ اور دوسروں کو خوشیاں دینے والے کبھی تنہا نہیں ہوتے۔ ارسلان کو اس عید پر حقیقی خوشی ہوئی تھی۔

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

فلاح

(مریم عائشہ، پنڈ دادنخان)

دوپہر کے دو بج رہے تھے مگر عروج اب تک اسکول سے نہ لوٹی تھی۔ اس کی بڑی بہن سنبل کو فکر لاحق ہو رہی تھی۔ امی ابا شادی کی دعوت میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ظہر کی نماز پڑھ کر سنبل نے عروج کے بہ خیریت لوٹنے کی دعا کی۔ ابھی وہ دعا سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے عروج پریشان چہرہ لیے کھڑی تھی۔ ''کیا ہوا عروج؟ تم اتنا لیٹ کیوں آئیں؟'' سنبل نے پوچھا جس پر عروج جواب دینے کی بجائے سیدھا اندر گھس آئی اور کچن میں جا کر فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور غٹاغٹ ایک ہی سانس میں پینے لگی۔

''اب بتا بھی دو، کیا ہوا ہے؟'' سنبل وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ عروج پانی پی کر فارغ ہوئی تو کندھے سے لٹکا اپنا بیگ اتارا اور اس میں سے ایک کاپی نکال کر سنبل کے سامنے رکھ دی جس پر نہایت خوب صورت کور چڑھا ہوا تھا۔ سنبل نے حیرت زدہ ہو کر کاپی اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کاپی کے دائیں صفحے پر بڑا بڑا سا ''ماہین ہاشم'' لکھا ہوا تھا۔ سنبل نے سوالیہ نظروں سے عروج کی طرف دیکھا جس پر عروج گویا ہوئی۔

''ماہین میری کلاس فیلو ہے۔ کچھ دن پہلے اس نے میرے بیگ سے پیسے چرا لیے تھے۔ میری دوستوں کو بھی میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے اور کل تو اس نے حد کر دی اور کہا کہ میں اسے خواہ مخواہ تنگ کرتی ہوں۔ یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔''

''تم پڑھائی میں اس سے بہتر ہو۔ شاید اسی جلن کے تحت وہ تم سے ایسا سلوک کرتی ہو۔'' سنبل نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ''وجہ جو بھی ہو، میں نے بھی اسے ایسا سبق سکھایا ہے کہ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ ہماری ریاضی کی استانی صاحبہ بہت سخت ہیں۔ پڑھائی میں کوتاہی بالکل برداشت نہیں کرتی اور ہوم ورک نہ کرنے پر تو جان ہی نکال لیتی ہیں۔ میں ماہین کے بیگ سے ریاضی کی کاپی نکال کر لے آئی ہوں۔ دیکھنا، کل اس کے ساتھ کیا ہوگا؟'' عروج چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

''یہ غلط طریقہ ہے عروج! تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ماہین اس طرح کی حرکتیں کر کے تمہارا دھیان پڑھائی سے ہٹانا چاہتی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے، وہ کامیاب ہو رہی ہے کیوں کہ تم اپنی پڑھائی پر توجہ دینے کی بجائے اسے سبق سکھانے کی فکر میں لگی ہوئی ہو۔ بُرائی کا جواب بُرائی سے نہیں دینا چاہیے۔ جانتی ہو؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے: ''اگر تم اپنے دشمن سے بہترین انتقام لینا چاہتے ہو تو اپنی خوبیوں میں اضافہ کرلو۔''

سنبل نہایت رسانیت سے عروج کو سمجھائے جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد عروج ریاضی کی کاپی ہاتھ میں تھامے، محلے کے کسی بچے کو ماہین کا گھر سمجھا رہی تھی۔ وہ ماہین کی کاپی اسے واپس بھجوا رہی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں، بلکہ اچھائی سے دیا جاتا ہے۔

سالانہ امتحانات نہایت قریب آ چکے تھے۔ ماہین ابھی بھی عروج کو تنگ کرنے کے لیے طرح طرح کی حرکتیں کرتی رہتی مگر عروج نے پہلے سے زیادہ ڈٹ کر پڑھائی شروع کر دی۔ اس نے اپنے آپ کو بہتر سے بہتر بنانا تھا۔

ماہین بہت خوش تھی کہ سارا سال عروج کو تنگ کر کے، اس کا دھیان پڑھائی سے ہٹانے میں کام یاب رہی ہے۔

عروج پوری کلاس میں اوّل نمبر پر آئی تھی جب کہ دوسری طرف ماہین بُری طرح سے فیل ہوئی تھی۔ عروج کو نیچا دکھانے اور اسے تنگ کرنے کی کوششوں میں لگے رہنے کی بدولت، اس کا دھیان پڑھائی سے ہٹ چکا تھا اس لیے آج وہ ایک کونے میں کھڑی رو رہی تھی۔

''تمہارا شکریہ سنبل! تم نے میری صحیح راہنمائی کی۔'' عروج، سنبل کے گلے لگ گئی۔

''بے شک، دین کی باتوں میں فلاح ہے۔'' سنبل نے تشکرانہ انداز میں آسمان کی طرف دیکھا اور عروج کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی جانب چل پڑی جہاں ان کے والدین ان کے منتظر تھے۔

(دوسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

حلال کی کمائی

(حریم جان، گوجرانوالہ)

آج پھر عاشر صاحب کی بیوی اپنے میاں کو کوس رہی تھیں کہ ان کے پاس نہ تو گاڑی ہے اور نہ بنگلہ اور نہ ہی ان کے بچے

بڑے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ شام کو پھر دونوں میاں بیوی میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ ان کی بیوی پھر انہیں ان کے دوست اظہر کی مثال دینے لگیں۔ ”دیکھیں ان کے پاس کتنا بڑا بنگلہ ہے اور کتنی گاڑیاں اور ایک ہم ہیں ہر وقت رکشوں پر دھکے کھاتے ہیں۔ ڈرائنگ روم کی چھت پھر سے ٹپکنے لگ گئی ہے۔“

”تنخواہ ملے گی تو ٹھیک کروا لیں گے۔“ عاشر صاحب نے جان چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

اظہر، عاشر کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ ان دونوں میں کافی دوستی ہو گئی تھی۔ یوں تو وہ دونوں ایک ہی پوسٹ پر تھے لیکن اظہر صاحب کے پاس ناجائز ذرائع سے حاصل کیا گیا بہت سا روپیہ تھا۔ ان کا پیسہ دیکھ کر عاشر صاحب کی بیوی بھی انہیں ناجائز کام کرنے کو کہتی لیکن وہ اپنا ضمیر بیچنے کو تیار نہ ہوتے اور اپنی بیوی کو بہت سمجھاتے کہ حرام کی کمائی سے آسائشیں تو مل جاتی ہیں لیکن دل کا سکون کبھی نصیب نہیں ہوتا اور حرام کا پیسہ زیادہ دیر تک نہیں رہ پاتا۔ ایک نہ ایک دن اللہ کی پکڑ ضرور ہوتی ہے لیکن ان کی بیگم صاحبہ کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔

آج عاشر صاحب کی بیوی اپنی بیٹی کے ساتھ بازار جانے کے لیے باہر نکلیں تو بہت دیر انتظار کے بعد انہیں ایک رکشہ ملا۔ رکشے والے نے بازار تک جانے کے لیے دو سواریوں کا کرایہ بیس روپے مانگا۔ کچھ ہی دیر میں باقی چار سیٹوں پر بھی دو عورتیں اور دو مرد بیٹھ گئے اور رکشہ بازار کی طرف چل پڑا۔ عاشر صاحب کی بیوی نے کرائے کے لیے بیس روپے نکالے تو تیز ہوا سے ان کے پیسے ان کے ہاتھ سے نکل کر اڑ گئے۔ دس روپے کا ایک نوٹ پیچھے بیٹھی بچی نے پکڑ لیا اور انہیں دے دیا اور باقی دس کا نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”آنٹی! یہ آپ کے دس روپے سڑک پر گر گئے تھے۔“

عاشر صاحب کی بیوی حیرانی سے پیسے دیکھنے لگیں۔ پیچھے سے اترنے والی عورت نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔

”بہن! لگتا ہے آپ کے شوہر بہت ایمان داری سے کماتے ہیں اور حلال ہی کماتے ہوں گے۔ اسی لیے تو اللہ نے آپ کو آپ کے پیسے لوٹا دیئے۔“

”ہاں! میرے میاں ہمیشہ حلال کماتے ہیں۔“ یہ الفاظ کہتے ہوئے انہیں خود پر اور اپنے میاں پر فخر محسوس ہونے لگا۔

ادھر اظہر صاحب کے گھر پر چوری ہو گئی۔ ان کی رشوت خوری کی خبر پولیس تک جا پہنچی اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ ہمیں ہمیشہ حرام سے دور رہنا چاہیے اور حلال کی روزی کمانی چاہیے، چاہے وہ کم ہی کیوں نہ ہو۔

(تیسرا انعام: 115 روپے کی کتب)

ماں کی نافرمانی

(کلثوم عتیق، اٹک)

فرہاد کمرۂ امتحان میں بیٹھا دل ہی دل میں اللہ کا ذکر کر رہا تھا۔ تمام طلباء کے چہروں پر بے چینی تھی۔ سب کو ایک ہی دھڑکا تھا کہ نہ جانے پیپر کیسا ہو گا، لیکن فرہاد پُراعتماد تھا کیوں کہ اس نے محنت کی تھی۔ پیپر شروع ہو گیا تھا۔ سوالیہ پرچہ دیکھ کر فرہاد کی خوشی کا ٹھکانا ہی نہ رہا کیوں کہ اس کو تمام سوالات بہت اچھی طرح سے آتے تھے۔ لیکن یہ کیا؟ جونہی اس نے لکھنا شروع کیا تو تمام سوالات بھول گیا۔ وہ اس اچانک بُری صورت حال سے بہت گھبرایا۔ اس نے ذہن پر بہت زور دیا لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ اس نے ہال میں نظر دوڑائی تو دیکھا کہ تمام طلباء سر جھکائے پیپر کرنے میں مصروف تھے۔ صرف ایک وہ ہی تھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

”یا مالک! آخر میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے......؟ میں نے تو پوری تیاری کی تھی...... میرے مالک مجھ پر رحم فرما۔“ بے بسی سے سوچتے ہوئے وہ رونے کے قریب ہو گیا۔

”تم نے تو بہت اچھی تیاری کی تھی۔ کچھ یاد ہے رات کو کیا کیا تھا...... تم تو سکون سے سو گئے تھے لیکن تمہاری وجہ سے تمہاری ماں رات بھر روتی رہی...... اور یاد ہے کہ صبح کیا حرکت کر کے آئے ہو؟“ یہ اس کے ضمیر کی آواز تھی جس نے اس کو رات والی ساری بات یاد دلا دی تھی۔ واقعی، وہ تو سب کچھ بھول گیا اور اسے یاد آیا کہ رات کو ماں نے سر میں درد کی وجہ سے اس سے پانی مانگا تو اس نے کس قدر غصے سے جواب دیا تھا۔ ”کیا مصیبت ہے ایک تو آرام سے پڑھنے بھی نہیں دیتی ہیں آپ......“ اور پھر ماں نے خود ہی پانی پی لیا تھا۔ پھر رات کو کھانے میں ٹنڈے بنے ہوئے دیکھ کر وہ غصے سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ ماں نے لاکھ منتیں بھی کیں کہ کوئی اور چیز بنا دیتی ہوں لیکن اس کی ایک ہی ضد تھی کہ ”جب آپ کو

پتا بھی ہے کہ یہ سبزی مجھے پسند نہیں ہے تو پھر روزانہ کیوں بنا دیتی ہیں۔" ماں کو اس کی باتوں سے بہت دُکھ ہوا اور وہ دُکھی دل کے ساتھ بغیر کھائے رات بھر روتی رہی۔ رونے کی وجہ سے ماں کو بخار ہو گیا لیکن اس کے باوجود انہوں نے فرہاد کے لیے ناشتا تیار کیا۔ فرہاد نے ان کا حال تک نہ پوچھا اور ناشتا کرتا رہا۔ دل نے کہا کہ ماں سے دعا تو لیتے جاؤ لیکن اس نے سوچا کہ "دعا سے کیسے کامیابی ملے گی جب کہ محنت تو میری اپنی ہی ہو گی، جتنی محنت کروں گا اتنا ہی پیپر اچھا ہو گا۔" اب اس کو ماں کی نافرمانی کی سزا مل چکی تھی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ ماں کی دعا سے ہی کامیابی مل سکتی ہے کیوں کہ ماں راضی ہو گی تو خدا بھی راضی ہو گا۔ اس نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ "میں آج کے بعد کبھی بھی ماں کا دل نہیں دکھاؤں گا۔" گھر آ کر اس نے ماں سے معافی مانگی۔ ماں نے معاف کر دیا اور فرہاد نے شکرانے کے نوافل ادا کیے اور اس کے بعد کبھی بھی ماں کا دل نہ دکھایا اور آج وہ ایک بہت بڑا ڈاکٹر ہے اور یہی کہتا ہے کہ "میری کامیابی کا راز میری ماں کی دعائیں ہیں۔"

ساتھیو! ماں کی نافرمانی سے ہمیشہ بچنا...... کیوں کہ جو ماں کی نافرمانی کرتا ہے اس کو دنیا و آخرت میں سکون نہیں ملتا۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

(میمونہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

بہت سال پہلے کی بات ہے کسی گاؤں میں خالد اور حامد دو بھائی رہتے تھے۔ حامد بہت محنتی تھا جب کہ خالد بہت کاہل اور ست تھا۔ دونوں کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ ان دونوں کی زمینیں بھی تھیں۔ وہ اپنی زمین کو محنت و مشقت سے کاشت کرتے تھے۔ خالد، حامد کی عزت کرتا تھا۔ اسی لیے دونوں خوش رہ رہے تھے۔ حامد زمین میں اچھے بیج لگایا کرتا جب کہ خالد ہر وقت سویا رہتا۔ ایک دن اچانک بڑے بھائی خالد کو خیال آیا کہ دونوں کو زمین تقسیم کر لینی چاہیے۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی حامد سے مشورہ کیا۔ چھوٹے بھائی نے سوچا کہ بڑے بھائی کو کام کرنے کی عادت تو نہیں ہے۔ آخر وہ الگ زمین کا کیا کرے گا۔ مجبوراً اس نے بھی ہاں کر دی۔ بڑے بھائی نے زمین کے سارے زرخیز حصے اپنے پاس رکھ لیے اور چھوٹے بھائی کو بنجر اور پتھریلے حصے دے دیے۔ بیل اپنے پاس رکھ لیا اور کتا چھوٹے بھائی کو دے دیا۔ چھوٹا بھائی بے حد رنجیدہ ہوا۔ اسے یہ پریشانی بھی تھی کہ بیل کے بغیر وہ پتھریلی اور بنجر زمین کیسے کاشت کرے گا لیکن اس نے ہمت سے کام لیا اور دوسرے دن صبح سویرے اپنے کتے کے ساتھ زمین پر پہنچ گیا۔ اس نے بے سروسامانی کے باوجود محنت سے کام لیا۔ سب سے پہلے اس نے زمین سے پتھر ہٹائے اور کدال سے زمین کو بوائی کے لیے تیار کیا۔ زمین ٹھیک کرنے کے بعد اسے فکر ہوئی کہ بیج کیسے حاصل کیا جائے؟ اسی فکر میں وہ کھیتوں سے نکل کر جانے لگا۔ راستے میں اسے زخمی پرندہ نظر آیا جس کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہوا تھا۔ حامد نے فوراً اس کے پاؤں سے کانٹا نکالا۔ زخم صاف کیا اور پرندے کو چھوڑ دیا۔ پرندہ اُڑ کر درخت پر بیٹھ گیا۔ حامد جیسے ہی آگے بڑھا اسے آواز سنائی دی۔ "حامد! حامد! ......" اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا تو کسی کو نہ پایا اور درخت پر بیٹھے پرندے سے پوچھا۔ "کیا تم نے مجھے آواز دی ہے؟" پرندے نے کہا۔ "ہاں میں نے آواز دی ہے۔" "حامد میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت محنت کر رہے ہو اور آج میں تمھیں تمہاری محنت اور ہمدردی کا انعام دینا چاہتا ہوں۔"

حامد نے پوچھا۔ "انعام؟" پرندے نے کہا۔ "تم اس درخت کے پیچھے پڑے تربوز کو اُٹھا لو۔ اس کے بیج تم اپنے کھیتوں میں بو دو۔" حامد کو پرندے کی بات پر حیرت ہوئی۔ وہ پرندے کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پرندے کا شکریہ ادا کیا اور تربوز کو اُٹھا لیا۔ اگلی صبح اس نے تربوز کے بیج کھیت میں ڈال دیے۔ شام کو کھیت میں پانی دے کر وہ گھر چلا آیا۔ ہر روز حامد اپنے کھیت میں جا کر صبح بیج لگاتا اور شام کو پانی دے کر واپس گھر آ جاتا۔ رفتہ رفتہ اس کا کھیت تربوز کی بیلوں سے بھر گیا۔ اس نے تربوزوں کو اچھے داموں بازار میں فروخت کیا اور خوب رقم کمائی۔ محنت نے حامد کے دن پھیر دیے۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔ دوسری طرف خالد اپنی کاہلی اور سستی کی وجہ سے ہرے بھرے کھیتوں کو بھی اجاڑ بیٹھا۔ سچ ہے کاہل اور ست انسان اپنی کاہلی اور سستی سے سونے کے پہاڑ کے باوجود آخرکار خالی ہاتھ رہ جاتا ہے اور محنت کرنے والا مٹی میں بھی سونا اُگا سکتا ہے۔

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

ایڈیٹر کی ڈاک

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ نے میرا خط گزشتہ ماہ شائع کیا۔ امتحانات کے بعد میں نے تعلیم و تربیت کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ درسِ قرآن و حدیث نے ہمیشہ کی طرح ہمارے عقل و شعور کو روشنی کی سمت موڑ دیا۔ پیارے اللہ کے پیارے نام نہ صرف میرا بلکہ میری اماں جان کا بھی پسندیدہ سلسلہ ہے۔ سنہری جزیرہ، ناول دولت پور میں انتہائی دل چسپ تھے۔ ٹیپو سلطان اور جہانگیر خان پڑھ کر اپنے اسلاف پر فخر محسوس ہوا۔ محمد علی کلے پر بھی مضمون شائع کریں۔

(مناہل افضل، لاہور)

☆ مناہل افضل! پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ ہماری باقاعدہ اور ہونہار قاری ہیں۔ آپ کی اور آپ کی والدہ صاحبہ کی آراء کا انتظار رہے گا۔ والدہ صاحبہ کو سلام دیجیے گا۔

اس بار کا رسالہ بہت زبردست تھا۔ ہم اپنی تصویریں ڈھونڈتے رہے، وہ آپ نے لگائی نہیں۔ پچھلی بار کتابوں کا انعام جیتا جو ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ اپنا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔

(عبداللہ طاہر، صفی طاہر، گوجرانوالہ)

آپ کا کیا حال ہے؟ پہلے کی نسبت تعلیم و تربیت میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ سلسلہ "میری بیاض سے" بہت پسند آیا۔ رمضان المبارک کی پیشگی مبارک باد قبول کریں۔ رمضان میں بہت مزا آتا ہے۔ میں سارے روزے رکھتی ہوں۔ اس بار بھی رکھوں گی۔

(الزاح اکبر، لاہور)

میں تعلیم و تربیت کی نئی قاری ہوں۔ پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ اس بار بھی میگزین بہت اچھا تھا۔ تمام چیزیں اچھی تھیں۔ تمام قارئین کے لیے دعا گو ہوں۔

(رمشاء کنول، چک جمرہ)

ہمیشہ کی طرح سرورق پسند آیا۔ کہانیاں بہت پسند آئیں۔ نور محل کے بارے میں پڑھ کر اس کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ نظم جاگو جاگو ہوا سویرا اچھی تھی۔ ذائقہ کارنر میں تکہ بوٹی کی ترکیب پڑھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ سچ کی خوش بو اور حضرت ابوبکرؓ کا پڑھ کر ان کے عہد کے متعلق پتا چلا۔

(حدیقہ عارف، لاہور)

☆ آپ سب نے بہت خوب صورت اور رنگین خط لکھے ہیں۔ آپ کی محبت اور شوق کا بہت شکریہ۔

السلام علیکم! میں نے پہلی مرتبہ خط لکھا ہے۔ مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے دیکھ کر میری دوست ملائکہ، تحریم اور مہرین نے بھی یہ رسالہ پڑھنا شروع کر دیا ہے کیوں کہ اس میں بہت معلومات ہوتی ہیں۔ مئی کا شمارہ بہت اچھا تھا۔

(عدن سجاد، ملائکہ رانی، حسنین علی، جھنگ صدر)

اس بار بھی رسالہ ٹاپ پر رہا۔ میں اپنی کہانیوں کو نہ پا کر بہت اداس ہوئی۔ کیا وہ شائع ہوں گی؟ تجسس کی معذرت۔ جاگو جاگو ہوا سویرا، انجام اور نور محل بہت پسند آئے۔

(میمونہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

تعلیم و تربیت مجھے بہت پسند ہے کیوں کہ اس میں انعامات کی برسات ہوتی ہے۔ ہر شمارہ پڑھتا ہوں۔ آج پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ کہانیوں میں راز، استاد جی، دوسرا قرض اور پتھر کا قلعہ بہت پسند آئیں۔ سلسلہ مختصر مختصر بہت پسند آئے۔

(محمد شہریار، شاہ کوٹ)

میں نے آپ کو ایک حکایت بھیجی تھی۔ آپ نے نہ حکایت شائع کی اور نہ ہی جواب دیا۔ میں نے آپ کو ایک کہانی بھیجی ہے۔ ضرور جگہ دیں بشرطیکہ معیاری ہو۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔

(محمد نعیم امین، لاہور)

☆ ڈیئر نعیم! آپ بہت اچھے بچے ہیں۔ آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ میری کہانی معیاری ہو تو ضرور شائع کریں۔ آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

میں ہفتم جماعت کی طالبہ ہوں۔ میری چھوٹی بہن اور کزن بہت شوق سے تعلیم و تربیت پڑھتے ہیں۔ ہماری ماما اور خالہ بچپن سے پڑھ رہی ہیں۔ پیارے اللہ کے پیارے نام ہمیں بہت پسند ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔

(اریب مدثر، ماہین مدثر، شیزا عمران)

جون کا شمارہ بہت خوب صورت اور دل کش تھا۔ سب کہانیاں زبردست تھیں۔ لطائف نے پورے شمارے کا مزا دوبالا کر دیا۔ شاعری کا سلسلہ بھی اچھا ہے۔ مجھے شکایت ہے کہ میں اپنی بہت سی تحریریں بھیج چکا ہوں لیکن شائع نہیں ہوئیں۔ (مظفر حیات، رانا شاہد، رود وتل)

جون کا شمارہ ٹاپ پر تھا۔ سالانہ خریدار بننے کے لیے کیا کرنا پڑے گا۔ میں آپ کے ٹیلی فون نمبروں پر کال کرتا ہوں لیکن کوئی رابطہ نہیں ہو پاتا۔ (سید محمد علی حسن، لاہور)

☆ سالانہ خریدار بننے کے لیے 850 روپے کا منی آرڈر تعلیم و تربیت کے پتے پر روانہ کر دیں۔ آپ اپنا رابطہ نمبر ضرور لکھ کر بھیجیں۔

میں دس سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ یہ میرا پہلا خط ہے، امید ہے ضرور شائع ہوگا۔ اس کے علاوہ کچھ تحریریں بھی بھیجی ہیں۔ ضرور شائع کیجئے گا، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔ مئی کے شمارے میں تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ سنہری جزیرہ زیادہ پسند آئی۔ (عائشہ سلام، آمنہ سلام، اسلام آباد)

میں دسمبر 2009ء سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں مگر خط پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے دوستوں عبدی، کرشش اور حاجی کو اس کا مستقل قاری بنا دیا ہے۔ (ارسلان بھٹی، ڈیرہ اسماعیل خان)

یہ میرا تعلیم و تربیت میں پہلا خط ہے۔ امید ہے ضرور شائع ہوگا۔ سلسلہ آپ بھی لکھئے بہت اچھا ہے۔ اس سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ میں نے بھی ایک کہانی لکھی ہے جو اگلی بار ارسال کروں گا۔ بلا عنوان میں کراچی والوں کا نام نہیں ہوتا۔ جون کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ (عریشہ، آمنہ، سیف، محمد احمد، کراچی)

☆ تعریف کا شکریہ! کہانی ضرور ارسال کریں۔ بلا عنوان میں کراچی والوں کا نام اکثر آتا رہتا ہے۔

میں تعلیم و تربیت ایک سال سے پڑھ رہی ہوں۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ میرے تمام بہن بھائیوں کو بھی پسند ہے۔ کہانیاں استاد جی، ہم بھی آخر بچے ہیں، بہت اچھی تھیں۔ (نایاب آفریدی، پشاور)

امید کرتی ہوں آپ ٹھیک ہوں گے۔ میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میرے تمام گھر والے اس کے دیوانے ہیں اور سب باری باری پڑھتے ہیں۔ میں ایک طالب علم ہوں، مجھے کتابوں سے بہت پیار ہے۔ جون کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ استاد جی اور پتھر کا قلعہ اچھی کہانیاں تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ بہت گرمی ہے۔ (سفینہ عثمان، وزیر آباد)

تعلیم و تربیت بہت اچھا اور انتہائی دل کش میگزین ہے۔ اس کے سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ میں اس کا پرانا قاری ہوں۔ بلا عنوان کے تحت وہ عنوانات جو انعام کے حق دار نہیں ہوتے، ان کے عنوانات بھی شائع کر دیا کریں۔ (شاہ زیب احمد، چنیوٹ)

☆ آپ کی تجویز پر عمل کریں گے۔ خط لکھنے کا شکریہ!

میں سات سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں اور خط پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ ایک نظم بھیج رہا ہوں، پلیز ضرور شائع کیجئے گا۔ میری لکھائی کیسی ہے؟ میرا خط ردی کی ٹوکری سے بچائیے گا۔ (حافظ بلال صدیق، منڈی یزمان)

میں نے کچھ مضامین بھیجے تھے مگر آپ نے اپریل، مئی میں نہیں لگائے۔ تاہم ایک مرتبہ پھر ارسال کر رہا ہوں۔ (عبدالوحید مزاج، میاں والی)

☆ جناب عبدالوحید صاحب! آپ اپنا رابطہ نمبر ارسال کریں یا خود رابطہ کریں۔

پچھلے ماہ بورڈ کے امتحانات کی وجہ سے حاضری نہ دے سکی۔ جون کے شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ ناول ''دولت پور میں'' زبردست جا رہا ہے۔ باقی سلسلے بھی اچھے ہیں۔ ''میری بیاض سے'' زبردست سلسلہ ہے۔ (مریم صدیقہ راجپوت، گوجرانوالہ)

اس کے علاوہ جن بچوں کے خطوط ہمیں موصول ہوئے ان کے نام یہ ہیں:
ہمایوں رشید، اسلام آباد۔ مہرین آمین، جھنگ صدر۔ حافظ محمد ذکوان شفیق، چشمہ۔ ثروت یعقوب، مصباح صابر، آمنہ ظفر، سائرہ رحمٰن، عابد رحمٰن، غالیہ ارم، محمد حمزہ مقصود، خرم اقبال، سرگودھا۔ کرن فاروق، صبا شوکت، گوجرانوالہ کینٹ۔ حافظ عبداللہ انعام، گجرات۔ سعیدۃ النساء، صفاء رشید، کراچی۔ محمد زبیر جمشید، خانیوال۔ سعید احمد، اٹک۔ محمد عمیر سلیم، ساہی وال۔ صبا جاوید، ایبٹ آباد۔ محمد حسنین معاویہ، ڈی آئی خان۔ محمد احمد، چیچہ وطنی۔ قاری محمد ندیم عطاری، اوکاڑہ۔ عبداللہ ایوب، جہلم۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔

☆☆

استانی کہاں گئیں؟

عزیز اثری

طارق دریا سے پیدل واپس آ رہا تھا۔ اسے راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا کیوں کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ طارق کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو گیا، کیسے ہو گیا۔

طارق رو رہا تھا اور چل رہا تھا۔ چل رہا تھا اور رو رہا تھا۔ اس سے پہلے جب سب لوگ اسے دریا کے کنارے چھوڑ کر چلے گئے تھے، وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اس وقت وہ کنارے پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔

طارق کوٹھی کے پھاٹک پر رُک گیا۔ آنکھوں سے آنسو پونچھے۔ اپنی قمیص سے منہ کو اچھی طرح صاف کیا اور ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ طارق کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ باغ کے پاس سے گزرنے لگا تو احتیاط سے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ طارق نے سوچا کہ فریدہ اور جعفر مجھ سے بہت پہلے کوٹھی میں پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے فریدہ کے ابا سے میری شکایت کر دی ہو گی۔ میری ماں کو بھی پتا چل گیا ہو گا۔ جعفر نے دریا پر اتنا جھوٹ بولا تھا، یہاں آ کر تو اور بھی جھوٹ بولا ہو گا۔ طارق باغ کے پاس، اپنے مکان سے کچھ فاصلے پر رُک گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ فریدہ کے ابا اور امی نے میری ماں کو بتا دیا ہو گا۔ دوسروں کی طرح میری ماں نے بھی یہ سمجھ لیا ہو گا کہ میں نے ہی فریدہ کو دریا میں دھکا دیا ہے۔ نہیں، میری ماں نے یقین نہیں کیا ہو گا۔ طارق نے اپنے آپ سے کہا۔

''میری ماں تو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے......'' اور فوراً ہی طارق نے سوچا۔ مگر فریدہ نے کیسے جعفر کی بات مان لی لیکن میں نے اس سے لڑائی کی تھی۔ وہ مجھ سے ناراض تھی۔ اسی لیے اس نے جعفر کی بات کا یقین کر لیا۔

طارق چند قدم آگے بڑھا۔ اس نے اپنے مکان کا دروازہ کھلا دیکھا۔ اسے پتا چل گیا کہ ماں گھر پر ہی ہے۔ طارق نے سوچا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے...... تو اس کا مطلب ہے کہ ماں نے بھی جعفر کی جھوٹی باتوں کا یقین کر لیا ہے۔ اسی لیے وہ اب میرا انتظار کر رہی ہے تاکہ میں گھر جاؤں اور وہ مجھے جاتے ہی ڈانٹنے لگے۔

طارق پھر رُک گیا۔ اس نے پھر مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا اور فوراً سوچا۔ مجھے گھر نہیں جانا چاہیے۔ مجھے ماں ڈانٹے گی۔ مجھے کبھی ماں کی ڈانٹ نہیں پڑی۔ میں اپنی ماں کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا۔ طارق نے فیصلہ کیا۔ ''میں گھر نہیں جاؤں گا۔ ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔'' طارق یہ ارادہ کر کے مڑنے ہی لگا تھا کہ اس کی ماں نے دیکھ لیا اور اسے آواز دی۔ اس سے پہلے کہ طارق پھر کچھ سوچتا۔ اس کی ماں گھر سے بھاگی ہوئی آئی اور اپنے بیٹے سے کہا۔

''میرے لال! میرے بچے......'' ماں کی آنکھوں سے محبت کے دریا بہہ نکلے۔ ماں کی آواز گلے میں اٹک گئی اور اس نے اپنے بیٹے کو

اور بھی زور سے سینے سے لگا لیا۔ طارق کی ماں اپنے بیٹے کو مکان میں لے گئی۔ طارق اب تک رو رہا تھا۔ ماں نے اسے چارپائی پر بٹھا دیا اور اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

''ماں! میں نے فریدہ کو بالکل دھکا نہیں دیا۔ جعفر مجھے دریا میں گرانے لگا تو میرا ہاتھ فریدہ کے بازو پر جا پڑا۔ پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا۔''

''میں جانتی ہوں بیٹا! مجھے سب معلوم ہے۔ تیرے ساتھ جعفر نے دشمنی کی ہے۔ وہ تمہارا دوست بنا ہی اس لیے تھا کہ......'' ماں چپ ہو گئی۔ باہر قدموں کی آواز آرہی تھی۔ ماں نے چونک کر دیکھا، دروازے میں فریدہ کا بوڑھا نوکر بابا کھڑا تھا۔ وہ طارق کی ماں سے کہنے لگا۔ ''بی بی! تم کام کرنے کیوں نہیں آئیں؟''

طارق کی ماں نے بابا کی بات سنی تو وہ اور بھی بے چین ہو گئیں۔ پھر بولیں۔ ''بابا ہم جا رہے ہیں۔''

''کہاں؟'' بابا حیران ہو کر بولا۔

''کہاں...... معلوم نہیں، لیکن یہاں سے میں اپنے بیٹے کو لے کر چلی جاؤں گی۔'' بابا کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ آگے آیا۔ طارق کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا اور طارق کو چپ کراتے ہوئے بولا۔

''رو نہیں بیٹے، میں جانتا ہوں تمہارا کوئی قصور نہیں۔''

''بابا میں نے فریدہ کو نہیں گرایا۔ جعفر نے مجھے دھکا دیا تھا۔''

''جعفر اور اس کا باپ ہمارا دشمن ہے۔ اس نے پہلے بھی میرے بیٹے کو مارنے کی کوشش کی تھی۔''

''اچھا!!'' بابا نے حیران ہو کر کہا۔ وہ کچھ سوچنے لگا، پھر بولا۔

''پھر تم لوگوں کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ میرا بیٹا پرانے شہر میں رہتا ہے۔ آپ لوگ وہاں چلے جائیں۔''

''نہیں بابا! ہم کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے۔'' طارق کی ماں نے کہا۔

''بوجھ کی کوئی بات نہیں، میرے بیٹے کے دو بچے ہیں۔ طارق بھی ان کے ساتھ رہے گا۔ میری بہو بھی بہت اچھی ہے۔ وہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گی۔'' بابا کے مجبور کرنے پر طارق کی ماں مان گئی۔ اس نے ٹرنک میں اپنے اور طارق کے کپڑے رکھے اور دونوں ماں بیٹا کوٹھی سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ سڑک کے اس طرف درخت کے نیچے لمبا کالا آدمی بیٹھا تھا۔ یہی آدمی دریا پر کشتی چلا کر انہیں دوسرے کنارے لے گیا تھا۔ طارق اور اس کی ماں نے کالے کو نہیں دیکھا لیکن کالا انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ طارق اور اس کی ماں کوٹھی کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ کالا بہت خوش ہوا اور اپنے دل میں کہا۔

''واہ! مزا آ گیا۔ میں ابھی جا کر جعفر کے ابا کو بتاتا ہوں۔''

کالے آدمی نے جب جعفر کے ابا کو بتایا کہ طارق کی ماں اپنے بیٹے کو لے کر کوٹھی سے نکل گئی ہیں تو جعفر کے ابا بہت خوش ہوئے۔ وہ فوراً کپڑے بدل کر تیار ہو گئے اور اپنی موٹر میں بیٹھ کر فریدہ کے گھر آ گئے۔

فریدہ کے ابا جان گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی کے لیے چائے بنوائی۔ اتنے میں جعفر اور فریدہ بھی اسی کمرے میں آ گئے۔ جعفر کے ابا نے کہا۔ ''جعفر بیٹا! تم گھر کیوں نہیں آئے۔ میں صبح سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''ابا جان! ہم لوگ دریا پر چلے گئے تھے۔'' جعفر نے جواب دیا۔

''دریا پر گئے تھے؟'' جعفر کے ابا بولے۔ ''بیٹا! مجھے بتا تو دیا ہوتا۔ میں تو صبح سے پریشان ہوں۔ اسی پریشانی کی وجہ سے یہاں بھاگا آیا ہوں۔''

''پریشانی کی تو کوئی بات نہیں۔'' فریدہ کے ابا بولے۔ ''یہ بھی تو آپ ہی کا گھر ہے۔''

''بات گھر کی نہیں بھائی جان، ان لوگوں کے دریا پر جانے کا سنا ہے تو کچھ پریشان ہو گیا ہوں۔ ہر روز اخبار میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں دریا میں ڈوب گیا۔''

''خدا نہ کرے، خدا نہ کرے۔'' فریدہ کے ابا فوراً بولے۔ وہ رک گئے۔ پھر جلدی سے کہنے لگے۔

''بھائی جان! ایک حادثہ تو آج ہوتے ہوتے رہ گیا۔''

''کیسا حادثہ!'' جعفر کے ابا نے چائے کی پیالی ہاتھ سے رکھتے ہوئے کہا۔

''ابا جان! آج فریدہ ڈوبنے لگی تھی۔''

''خدا نہ کرے، خدا نہ کرے۔'' اب کے جعفر کے ابا جلدی سے بولے۔ ''اس لیے تو میں کہتا تھا کہ دریا پر جانا ٹھیک نہیں۔''

''فریدہ تو جانے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔'' فریدہ کے ابا نے کہا۔ ''طارق اسے ساتھ لے گیا تھا۔''

''اور طارق ہی نے تو فریدہ کو دھکا دیا دے کر گرایا تھا۔'' جعفر نے فوراً کہا اور اپنے ابا کی طرف دیکھا۔

''مگر اس نے دھکا کیوں دیا؟'' جعفر کے ابا نے پوچھا۔ پھر خود ہی بولے۔ ''بہت کمینہ نکلا وہ لڑکا۔''

''ہم تو اسے اپنے بیٹے کی طرح جانتے تھے۔'' فریدہ کے ابا کہنے ہی لگے تھے کہ جعفر کے ابا، اپنے بھائی کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔

''آپ بھی تو آستین میں سانپ پالتے ہیں۔ اتنے کمینے لوگوں کو اپنے ہاں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس روز تمہاری نوکرانی کی صورت

دیکھی تھی تو فوراً سمجھ گیا تھا کہ یہ بڑی چالاک اور مکار عورت ہے۔"

"جی نہیں۔" فریدہ کے ابا بولے۔"وہ بے چاری تو......" اتنا ہی سنا تھا کہ جعفر کے ابا غصے سے بولے۔

"آپ پھر اس کی حمایت کر رہے ہیں بھائی جان! اسی نے تو اپنے بیٹے کو سکھایا تھا۔ ماں کے کہنے پر ہی اس سانپ کے بچے نے ہماری فریدہ کو ڈبونے کی کوشش کی۔"

"لیکن طارق کی ماں کو ہم سے کیا دشمنی تھی؟"

"آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں۔" جعفر کے ابا نے کہا۔ "حضور اس کا خیال تھا کہ فریدہ دریا میں...... (خدا نہ کرے) ڈوب جائے گی اور آپ کی ساری دولت طارق کے قبضہ میں آجائے گی۔"

یہ بات سن کر فریدہ کے ابا سوچ میں پڑ گئے۔ جعفر کے ابا نے کہا۔

"آپ اس عورت کو یہاں بلائیں۔ میں ابھی اس سے پوچھتا ہوں۔"

جعفر نے جلدی سے جواب دیا۔ "طارق کی ماں اپنے بیٹے کے ساتھ یہاں سے چلی گئی۔"

"دیکھا؟" جعفر کے ابا فوراً بولے۔

"وہ جھوٹی تھی۔ اس کے دل میں کھوٹ تھا۔ اس لیے بھاگ گئی ہے۔"

"وہ تو......" فریدہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن جعفر کے ابا نے اسے بولنے نہیں دیا۔ وہ کہنے لگے۔ "اچھا ہوا وہ دونوں دفع ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو دشمنوں سے بچا لیا۔ ہماری بیٹی فریدہ بھی بچ گئی۔ میں اس خوشی میں آج شام کو شان دار پارٹی دوں گا۔" یہ باتیں کرنے کے بعد جعفر کے ابا، جعفر کو ساتھ لے کر واپس چلے گئے۔

رات کو فریدہ کے ابا، امی اور فریدہ، جعفر کے گھر میں کھا پی رہے تھے۔ اسی وقت طارق اور اس کی ماں، بابا کے بیٹے کے گھر میں بیٹھے تھے۔ طارق کی ماں کے آنسو تو تھمتے ہی نہ تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد طارق کی ماں نے اپنے بیٹے سے کہا۔

"اب ہم اسکول کی فیس ادا نہیں کر سکیں گے۔ وہ اتنا اونچا اسکول ہے، تم اسے چھوڑ کر کسی سستے اسکول میں داخل ہو جاؤ۔"

یہ سن کر طارق کو بہت دکھ ہوا۔ اسے اپنے اسکول سے بڑی محبت تھی۔ وہ خاموش رہا۔ ماں نے کچھ سوچا اور بولی۔

"چلو...... تمہاری اُستانی کے پاس چلتے ہیں۔ ان سے کہیں گے کہ وہ تمہیں اسکول چھوڑنے کی اجازت دے دیں۔" ماں اور بیٹا جب اُستانی صاحبہ کے پاس پہنچے تو وہ دونوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوئیں۔ بولیں۔

"طارق بیٹے! کیا بات ہے تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

طارق کی ماں نے کہا۔

"میں اس کی ماں ہوں۔ میرا بیٹا آپ کا اسکول چھوڑ کر......"

"ہمارا اسکول چھوڑ کر؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"جی ہاں...... میں اپنے بیٹے کو کسی دوسرے اسکول میں داخل کراؤں گی۔"

"مگر کیوں؟" اُستانی اور بھی حیران ہو کر بولیں۔ "ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ طارق کو ہم سے چھیننا چاہتی ہیں۔" طارق کی ماں کوئی جواب نہ دے سکیں، اُستانی صاحبہ بولیں۔ "طارق ہمارا اتنا اچھا شاگرد ہے۔ ہم اسے اپنے اسکول سے نہیں جانے دیں گے۔"

"لیکن......" ماں کچھ کہنے ہی لگی تھیں کہ ان کا گلا بھر آیا۔ انہوں نے بولنے کی بہت کوشش کی لیکن بول نہ سکیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیوں کیا بات ہے، بہن جی!" اُستانی نے نرمی سے کہا۔

"آپ رو کیوں رہی ہیں؟" اپنی اماں کو روتا دیکھ کر طارق کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اُستانی جی نے طارق کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ "طارق بیٹے! کیا بات ہے، آخر آپ لوگ بتاتے کیوں نہیں۔" اُستانی کو اس قدر مہربان پا کر ماں کے منہ سے نکل گیا۔

"میرے بیٹے کی جان خطرے میں ہے۔" یہ سن کر اُستانی پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے پوری پوری ہمدردی ظاہر کی اور ہر طرح سے طارق کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ طارق تو میرا اپنا بیٹا ہے۔ یہ باتیں سن کر طارق کی ماں کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی اُستانی کو سنا دی۔

اُستانی کچھ دیر تک گم صم بیٹھی رہیں، پھر بولیں۔

"میں نے طارق کو بچانے کا ذمہ لیا ہے۔ میں ابھی جا کر فریدہ کے ابا جان سے بات کرتی ہوں۔"

"ایسا نہ کیجیے۔" طارق کی ماں نے کہا۔ "اس طرح تو جعفر کے ابا آپ کے بھی دشمن ہو جائیں گے۔" یہ سن کر اُستانی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور طارق کی ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "بہن جی! میں اُستانی ہوں۔ میں نے ہمیشہ بچوں کو سچ بولنے کا سبق دیا ہے۔ میں اسکول میں بچوں کو بہادر بننے کے لیے کہتی ہوں۔ میں خود سچ بولنے سے ڈروں گی تو میری بات کسی بچے پر اثر نہیں کرے گی۔"

"اُستانی جی، جعفر کا باپ بہت امیر آدمی ہے۔ وہ......"

"امیر آدمی تو ہے لیکن لالچی اور ظالم ہے۔" اُستانی نے کہا۔ "اور ظالم آدمی ہمیشہ ڈرپوک ہوتا ہے۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

اُستانی نے طارق اور اس کی ماں کو رخصت کیا اور خود ایک تانگے میں بیٹھ کر فریدہ کے گھر کی طرف چل پڑیں۔ انہوں نے کوٹھی کے باہر تانگہ رُکوایا۔ پھاٹک کے پاس اندھیرا تھا۔ اُستانی صاحبہ اندر داخل ہونے لگیں تو اندھیرے میں ایک شخص ان کی طرف بڑھا۔

"تم کون ہو؟"

"میں فریدہ کی اُستانی ہوں۔" اُستانی نے دلیری سے جواب دیا۔

"یہاں کیوں آئی ہو؟" آدمی نے غصے سے پوچھا۔

"میں فریدہ کے ابا سے ملنے آئی ہوں۔ طارق سے متعلق......"

اُستانی نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس آدمی نے پستول نکال لیا اور اُستانی کی طرف پستول کی نالی کر کے بولا۔

"خبردار...... یہیں سے واپس چلی جاؤ۔ اسی وقت فوراً۔" اگلے دن صبح کو طارق اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ طارق کا نیا گھر اسکول سے بہت دُور تھا۔ دُور تو پہلا گھر بھی تھا لیکن وہاں یہ آسانی تھی کہ وہ فریدہ کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اسکول جاتا تھا۔ اس لیے وہ اور فریدہ بہت جلد اسکول پہنچ جاتے تھے۔ طارق کو اس کی ماں نے آج منہ اندھیرے ہی جگا دیا تھا۔ طارق کو اتنی جلدی بستر سے اُٹھنے میں تکلیف ہوئی۔ رات کو وہ بہت دیر سے سویا تھا کیوں کہ وہ رات کو اپنی ماں کے ساتھ اُستانی صاحبہ کے گھر گیا تھا۔ اس کی نیک اور مہربان اُستانی نے طارق اور اس کی ماں کو تسلی دی تھی۔ اُستانی صاحبہ اسی وقت فریدہ کے ابا کو اصلی بات سچ سچ بتانے کے لیے فریدہ کے گھر گئی تھیں۔

طارق آج روٹی کھا کر جلدی جلدی اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اس کی ماں نے اسے سمجھایا۔ "بیٹا! ہم غریب ہیں لیکن غریب ہونے کے ساتھ ساتھ عزت والے بھی ہیں۔ تمہارے باپ نے ساری زندگی محنت کی ہے۔ حلال کی کمائی کھائی ہے۔ وہ کبھی دوسروں کی دولت دیکھ کر مایوس یا دکھی نہیں ہوا۔"

"میرے ابا نے میرے متعلق بھی کچھ کہا تھا؟" طارق نے اپنی ماں سے سوال کیا۔ اپنے بیٹے کا سوال سن کر ماں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا پھر بولی۔ "ہاں بیٹا! تو جب پیدا ہوا تھا تو تیرے ابا بہت خوش تھے۔ وہ کہتے تھے۔ میں اب اور بھی زیادہ کام کروں گا۔ میں دن رات محنت کر کے اپنے بیٹے کو خوب پڑھاؤں گا۔ اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بناؤں گا۔"

"فریدہ کے ابا کی طرح کا بڑا آدمی۔" طارق نے پوچھا اور ماں نے جواب دیا۔ "بڑے آدمی دولت سے نہیں بنتے میرے لال! علم اور نیکی سے بنتے ہیں۔ علم حاصل کرنے کے لیے محنت ضروری ہے۔ دُنیا میں وہی لوگ بڑے ہوئے ہیں جنہوں نے رُوکھی سوکھی کھا کر عزت حاصل کی ہے۔ دوسروں کے ساتھ بھلائی کی ہے۔ تو خوش نصیب ہے کہ تجھے اتنی اچھی اُستانی ملی ہے۔ تم ذرا سوچو کہ وہ ہماری کیا لگتی ہے لیکن اس نے ہمارے بھلے کے لیے اپنا آرام چھوڑ دیا اور فوراً فریدہ کے ابا سے ملنے چلی گئی۔" طارق اب پیدل اسکول جا رہا تھا۔ سارا راستہ اس کے سامنے اُستانی کی محبت بھری آنکھیں اور طارق کا چہرہ آتا رہا۔ طارق نے سوچا، ماں نے ٹھیک کہا ہے میری مس بہت نیک اور اچھی عورت ہیں۔ انہوں نے جا کر فریدہ کے ابا کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ فریدہ کے ابا بھی نیک آدمی ہیں۔ انہیں پتا چل گیا ہو گا کہ جعفر اور اس کے ابا ہمارے دشمن ہیں اور یہ ساری شرارت جعفر ہی کی ہے۔ طارق اسکول کے گیٹ پر پہنچا تو وہاں جعفر کی کار کھڑی تھی۔ جعفر کی نظر طارق پر پڑی تو جعفر بڑا حیران ہوا۔ پھر اسے غصہ آ

گیا۔ وہ جلدی سے طارق کی طرف آیا اور بولا۔ ''تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' طارق نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ منہ دوسری طرف پھیر کر اسکول کے پھاٹک سے گزرنے لگا۔ جعفر اس کے پیچھے آیا اور بولا۔

''تم اس اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔''

''کیوں نہیں پڑھ سکتا؟'' طارق بھی غصے سے بولا۔

''تمہاری فیس اب کون دے گا؟''

''تمہیں اس سے کیا۔''

''مجھے کیا؟......'' جعفر نے کہا۔ ''پہلے تو میرے تایا کے مال پر عیش کرتے تھے، اب تمہاری ماں کو ہم نے نوکری سے نکال دیا ہے۔ اب تم دونوں بھوکے مرو گے۔'' یہ سن کر طارق رُک گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ گرج کر بولا۔

''بکواس مت کرو ورنہ......'' اس سے آگے طارق کچھ نہ کہہ سکا۔ غصے سے اس کا جسم کانپنے لگا اور منہ سے نکلے ہوئے لفظ ٹوٹ گئے۔

جعفر نے دیکھا کہ طارق اس قدر غصے میں ہے تو وہ گھبرا گیا۔ جعفر کو یاد آ گیا کہ کچھ دن پہلے اسکول کے اسی پھاٹک پر طارق سے اس کی لڑائی ہوئی تھی اور طارق کے ساتھ دوسرے لڑکے بھی جعفر پر پل پڑے تھے۔ جعفر نے سوچا اب پھر میری پٹائی ہو جائے گی۔ وہ چپ ہو کر جلدی سے جماعت کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ کچھ بچوں نے جو اسکول میں داخل ہو رہے تھے، طارق اور جعفر کی باتیں سن لی تھیں۔ ایک لڑکا بولا۔

''لو بھئی، جعفر صاحب دم دبا کر بھاگے۔'' شریر لڑکا، جس نے ایک روز جعفر کو کرسی سے گرایا تھا، لپک کر جعفر کے پیچھے آیا اور اسی کا بازو پکڑ کر بولا۔ ''کیوں میاں ہیرو! طارق کی ٹھکائی نہیں کرو گے؟'' سب بچے ہنسنے لگے۔ جعفر اپنا بازو چھڑا کر کمرے میں بھاگ گیا۔

طارق جب کمرے میں داخل ہوا تو وہاں فریدہ پہلے سے بیٹھی تھی۔ اس نے طارق کو دیکھا تو زور سے بولی۔

''طارق بھائی!'' یہ کہہ کر فریدہ جلدی سے طارق کی طرف بڑھی۔

''تم رات کو کہاں چلے گئے تھے!'' یہ دیکھ کر جعفر، فریدہ کے پاس آیا اور بولا۔ ''تم ابھی تک اس سے باتیں کرتی ہو۔'' فریدہ خاموش ہو گئی لیکن وہ طارق کا منہ تکے جا رہی تھی۔

گھنٹی بجی، سب بچے باہر آ گئے۔ طارق نے سوچا رات کو استانی صاحبہ، فریدہ کے ابا سے ملنے گئی تھیں۔ انہوں نے سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ فریدہ کے ابا، امی اور فریدہ کو بھی اصل بات کا پتا چل گیا ہو گا۔ اسی لیے تو فریدہ مجھ سے باتیں کرنے لگی ہے۔

دعا کے وقت طارق کی نظریں اپنی استانی کو تلاش کرنے لگیں لیکن وہ نظر نہ آئیں۔ دعا ختم ہوئی، سب بچے اپنی جماعتوں میں چلے گئے۔ طارق اپنی جگہ پر بیٹھنے لگا تو فریدہ نے پھر کہا۔

''طارق تم کہاں چلے گئے ہو؟'' طارق جواب دینے ہی لگا تھا کہ جعفر نے غصے سے کہا۔ ''تم پھر اس سے بولتی ہو۔ آج صبح میرے ابا جان نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا۔''

''کیا؟'' فریدہ بولی۔

انہوں نے نہیں کہا تھا کہ طارق سے کبھی بات نہ کرنا۔'' یہ سن کر فریدہ سوچ میں پڑ گئی۔ جعفر پھر بولا۔

''اب ہم اسے اسکول سے بھی نکلوا دیں گے۔''

''مجھے اسکول سے کوئی نہیں نکلوا سکتا۔'' طارق نے کہا۔

''نہیں طارق! تمہارا خیال غلط ہے......'' ایک لڑکی ہنس کر بولی۔ ''جعفر تمہیں نکلوا سکتا ہے۔''

''کیوں؟'' چند آوازیں آئیں۔

''کیوں کہ وہ ہیرو ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا اور ساری جماعت زور زور سے ہنسنے لگی۔

''ہیرو میں بڑی طاقت ہے۔'' شریر لڑکا بولا۔ ''وہ طارق کو تو کیا ہم سب کو اسکول سے نکلوا سکتا ہے۔''

''کیوں؟'' چند آوازیں آئیں۔

''کیوں کہ ہمارا ہیرو چھپ کلیاں اور چوہے مارتا ہے۔'' ساری جماعت نے قہقہہ لگایا۔

اتنے میں استانی کمرے میں داخل ہوئیں۔ سب بچے خاموش ہو کر کھڑے ہو گئے۔ استانی کو دیکھ کر بچے حیران تھے کیوں کہ یہ استانی دوسری کلاس کی تھی۔

''ہماری مس نہیں آئیں۔'' ایک لڑکے نے پوچھا۔

''نہیں۔'' استانی نے جواب دیا۔

''کیوں نہیں آئی؟'' تین چار آوازیں بلند ہوئیں۔

''کیوں کہ تم لوگ بہت شور کرتے ہو۔'' دوسری کلاس کی استانی نے ہنس کر جواب دیا۔ بچوں کو اپنی استانی سے بہت محبت تھی۔ جب دوسری کلاس کی استانی نے پڑھانا شروع کیا تو بچوں کا دل پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا۔ بچے سوچ رہے تھے کہ ہماری مس تو کبھی اسکول سے چھٹی نہیں کرتیں۔ وہ ضرور بیمار ہو گئی ہوں گی۔ جماعت میں سب سے زیادہ پریشان طارق تھا۔ مس کیوں نہیں آئیں۔ کیا وہ بیمار پڑ گئی ہیں۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ وہ بولا۔ ''مس! ہماری مس بیمار ہو گئی ہیں کیا؟''

”نہیں بیٹے......“ اُستانی نے جواب دیا۔ پھر جلدی سے بولیں۔ ”مجھے کچھ پتا نہیں، اصل میں ان کی کوئی درخواست نہیں آئی۔ ہیڈ مسٹریس نے ان کے گھر چپڑاسی بھیجا ہے، وہ واپس آئے گا تو پتا چلے گا۔“ ایک لڑکی کتاب سے نظریں ہٹا کر بولی۔

”مس! ہمارے ایک سوال کا جواب آپ دیں گی؟“

”ہاں ہاں ضرور دوں گی۔ کون سا سوال ہے؟“

”سوال یہ ہے مس!“ وہی لڑکی بولی۔ ”کیا جعفر کسی دوسرے بچے کو اس اسکول سے نکلوا سکتا ہے؟“ یہ سوال سن کر اُستانی حیران رہ گئیں پھر بولیں۔ ”جعفر کون ہے؟“

”ہمارا ہیرو۔“ شریر لڑکا جلدی سے بولا۔ ”جو چوہے مارتا ہے۔“ بچے ہنسنے لگے۔ اُستانی صاحبہ نے بچوں کو چپ کرایا اور بولیں۔

”کوئی بچہ دوسرے بچے کو اسکول سے نہیں نکلوا سکتا کیوں کہ اسکول کسی کی کوٹھی یا بنگلہ نہیں ہے۔ اسکول علم حاصل کرنے کی جگہ ہے۔ اسکول امیر اور غریب، سب بچوں کے لیے ہے۔ بالکل ہمارے پیارے وطن کی طرح، جہاں امیر بھی رہتے ہیں اور غریب بھی۔“

”اب بتاؤ ہیرو میاں۔“ شریر لڑکے نے جعفر سے کہا۔

”اب آپ لوگ پڑھائی کی طرف توجہ دیں۔“ اُستانی نے کہا اور انہیں پڑھانے لگیں۔ ایک پیریڈ گزر گیا، دوسرا گزر گیا، تیسرا گزر گیا۔ یہاں تک کہ تفریح کی گھنٹی بج اُٹھی۔ طارق کی بے چینی بڑھ گئی۔ وہ برآمدے میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ ہیڈ مسٹریس وہاں سے گزریں۔ طارق نے انہیں سلام کیا۔ طارق پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔ ویسے بھی نیک بچہ تھا، اس لیے ہیڈ مسٹریس اسے جانتی تھیں۔ انہوں نے مسکرا کر طارق کے سلام کا جواب دیا۔ پھر بولیں۔ ”بیٹے! کیا حال ہے تمہارا؟“

طارق نے جلدی سے پوچھا۔ ”جی! ہماری مس آج کیوں نہیں آئیں؟“

یہ سن کر ہیڈ مسٹریس نے جواب دیا۔ ”میں بھی ان کے نہ آنے سے فکر مند ہوں۔ چپڑاسی دوبارہ ان کے گھر ہو آیا لیکن ان کے مکان پر تالا لگا ہے۔“

چھٹی کے وقت طارق جب واپس گھر جا رہا تھا تو تیز قدم چل رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد گھر پہنچ جائے اور اپنی ماں کو بتائے کہ ہماری مس آج اسکول نہیں آئیں اور وہ گھر پر بھی نہیں ہیں۔

ابھی وہ تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اسے سامنے سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ وہ قریب آیا تو طارق نے اسے پہچان لیا۔ یہ موٹا تھا۔ موٹا ہانپ رہا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

”بادشاہ لوکا! میں تجھے بہت دیر سے تلاش کر رہا ہوں۔“

”کیوں؟“ طارق نے پوچھا۔

موٹا بولا۔ ”ذرا رُک کر میری بات سن لے۔ تو تو بھاگا جا رہا ہے اور مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ میرا سانس اوپر نیچے ہو رہا ہے۔“ طارق رُک گیا۔ موٹے نے اِدھر اُدھر دیکھا اپنا سانس درست کیا اور بولا۔

”بات یہ ہے، مجھے پتا چلا ہے۔ تیری اُستانی کو انہوں نے قید کر دیا ہے۔“ ”قید کر دیا ہے؟“ طارق گھبرا کر بولا۔ ”کس نے؟“

”جعفر کے ابا کے آدمیوں نے۔“ موٹے نے کہا۔

”میں جا کر اپنی ہیڈ مسٹریس کو بتاتا ہوں۔“ طارق نے جلدی سے کہا۔

”اوئے ہیڈ مسٹر کیا کرے گی۔ ماملا بڑا گڑبڑیشن والا ہے۔ تو میرے ساتھ آ، جلدی کر۔“ اور طارق موٹے آدمی کے ساتھ چل پڑا۔☆

مچھلی (Fish)

مچھلی قدیم ترین ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے ٹھنڈے خون والے جانوروں میں سے ہے۔ مچھلیوں کی ارتقا 620 ملین سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ مچھلی پانی والی تمام جگہوں تالاب، جوہڑ، ندی نالے، دریا، نہریں اور سمندر وغیرہ میں رہ سکتی ہیں۔ مچھلی کا گوشت بہت لذیذ اور غذائیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ مچھلی گلپھڑوں کے ذریعے پانی کے اندر محلول آکسیجن اپنے جسم کے اندر لے جاتی ہے۔ آکسیجن نکلنے کے بعد پانی منہ کے ذریعے باہر نکال دیتی ہے۔ پانی میں مچھلیاں اپنی دم کو دائیں بائیں حرکت دے کر تیرتی ہیں اور پَروں کی مدد سے اپنا توازن برقرار رکھتی ہیں۔ پرندوں کی طرح مچھلیاں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتی ہیں۔ بعض مچھلیاں رنگ دار اور بہت دل کش ہوتی ہیں اور لوگ انہیں اپنے گھروں میں کسی برتن یا شیشے کے جار میں سجاوٹ وغیرہ کے لیے رکھتے ہیں۔ مچھلیوں کے پَر باریک چپٹی ہڈی کے ہوتے ہیں جن پر کھال چڑھی ہوتی ہے۔ ہاتھ اور پیروں کی جگہ پَروں کے جوڑے ہوتے ہیں۔ ان کا جسم چھلکوں سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے جو کہ ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں پر پپوٹے نہیں ہوتے۔ یہ اپنے نتھنوں کو سانس لینے کے بجائے سونگھنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ شارک ایک بہت بڑی جسامت کی مچھلی کی قسم ہے جو کہ اپنی بڑی جسامت کی وجہ سے مچھیروں، کشتی بان اور بحری جہاز وغیرہ کے لیے خطرے کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ وہیل اور ڈولفن بھی بڑی جسامت کی مچھلیوں کے لیے مشہور ہے۔ وہیل کا تعلق ممالیہ جانوروں سے ہے اور یہ انتہائی ہوشیار اور ذہین پانی کا جانور ہے۔ ڈولفن مچھلی بھی بڑی جسامت کی بہت ذہین اور انسان دوست ہے۔ ڈولفن کئی ملکوں کے سمندر اور دریاؤں میں پائی جاتی ہے۔ مچھلی کے منہ کے قریب وہ بال لگے ہوتے ہیں جن سے مچھلی چکھنے کا کام لیتی ہے۔ اس کی زبان، تالو اور گلوں میں بھی دانت ہوتے ہیں۔ مچھلی پانی کی کائی، پانی کی گھاس اور جڑی بوٹیوں پر گزارہ کرتی ہے اور بعض بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا کر اپنا پیٹ بھرتی ہیں۔ کچھ مچھلیوں کے گلپھڑوں کے نزدیک چھلنیاں لگی ہوتی ہیں۔ ان میں سے پانی تو چھن جاتا ہے لیکن چھوٹے چھوٹے جانور پیچھے رہ جاتے ہیں جنہیں مچھلیاں کھا جاتی ہیں۔ دنیا کے مختلف ادب میں مچھلی کا بہت زیادہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں بھی مچھلی کا کئی جگہوں پر حوالہ دیا گیا ہے۔ دنیا میں مچھلیوں کی بے شمار اقسام دریافت ہو چکی ہیں جن میں پانی کے علاوہ مچھلیاں خشکی پر رہ سکتی ہیں اور درختوں پر بھی چڑھ سکتی ہیں۔

''میرا بھائی محمد علی کیسا ہے؟'' ننھی فاطمہ اپنی بڑی بہن مریم جناح سے پوچھتی۔

''فاطمہ تم یوں سمجھ لو جیسے چاند کا ٹکڑا ہو۔'' بڑی بہن کہتی۔

''اچھا، میرا بھائی باتیں کیسی کرتا ہے؟''

''دل چسپ اور مزے مزے کی باتیں کیوں کہ وہ زیادہ پڑھتے لکھتے رہتے ہیں، پھر جب باتیں کرنے لگیں تو اتنی میٹھی باتیں کرتے ہیں گویا کوئی لوری دے رہا ہو۔''

یوں فاطمہ اپنے بھائی کے متعلق مختلف سوالات، تصورات و خیالات سے خود کو بہلاتی رہتی۔ بہن، بھائی کی یہ محبت بچپن سے ہی مضبوط ہوتی چلی گئی۔

1896ء کے ایک چمکیلے دن فاطمہ کو خبر ملی کہ ان کے بھائی انگلستان سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس آ رہے ہیں۔ فاطمہ کی خوشی دیدنی تھی۔ ننھی فاطمہ نے اپنے بھائی کو کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ بھائی نے آگے بڑھ کر بہن کو گود میں اٹھا لیا۔ محمد علی نے اپنی بہن فاطمہ کو ڈھیروں پیار دیا، تحفے دیے اور میٹھی میٹھی باتیں کیں۔

اب جب بھی بھائی کام سے فارغ ہوتے تو بہن زیادہ وقت بھائی کے پاس ہی گزارتی۔

محترمہ فاطمہ جناح 31 جولائی 1893ء کو کراچی کے نیونہام روڈ پر واقع ایک عمارت میں پیدا ہوئیں۔ جناح بھائی کے برادرِ نسبتی قاسم موسیٰ نے بڑے بیٹے کا نام محمد علی تجویز کر کے خاندان میں اسلامی نام رکھنے کی ابتداء کر دی تھی، چناں چہ اس بچی کا نام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لاڈلی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرہؓ سے عقیدت و محبت کے اظہار کے طور پر فاطمہ رکھا گیا۔ خاندان کے سبھی افراد نے اس نام کو پسند کیا۔

فاطمہ جناح کی پیدائش پر خاندان کے سبھی لوگ خوش تھے۔ فاطمہ جناح کے بڑے بھائی محمد علی جناح اس وقت انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے، چناں چہ بہن کی پیدائش کی خبر انہیں ملی تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ اپنے خط میں تعلیم مکمل ہونے کے فوراً بعد واپسی کا عندیہ دیا اور اپنی ننھی منی بہن کے لیے ڈھیروں پیار اور دعائیں لکھیں۔

بچپن میں فاطمہ کو چاکلیٹ بہت پسند تھی۔ کبھی کبھار تو وہ

چاکلیٹ کا پورا پیکٹ ہی کھا جاتی۔ اسی طرح سائیکل چلانا بھی بہت پسند تھا۔ اکثر دوپہر کو سائیکل چلا کر خوش ہوتی تھی۔ بھائی کا بھی تقریباً معمول تھا کہ دفتر سے گھر آتے تو فاطمہ کی پسند کی چاکلیٹ ضرور لاتے۔ چھٹی کے دن فاطمہ کو باہر گھمانے لے جاتے، جہاں سائیکلنگ کا شوق بھی پورا ہو جاتا۔

عام بچیوں کی طرح فاطمہ کو بھی بچپن میں گڑیوں کے کھیل سے دل چسپی نہیں تھی بلکہ وہ اپنے بھائی محمد علی کی طرح فارغ وقت میں مطالعہ کرتی اور معلومات میں اضافہ کر کے خوش ہوتی۔ بچپن میں فاطمہ بہت ضدی تھی مگر اس ضد سے کسی کو نقصان نہ پہنچاتی تھی۔ البتہ لباس کے معاملے میں بہت زیادہ نفاست پسند تھی۔ 1900ء میں عارضی مجسٹریٹ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد محمد علی جناح کی کامیابیوں کا سفر آگے بڑھا تو انہوں نے کراچی سے والد اور بہن بھائیوں کو ممبئی بلا لیا۔ فاطمہ جناح کی عمر اس وقت سات سال تھی۔

اللہ تعالیٰ نے فاطمہ جناح کو بچپن ہی سے سوجھ بوجھ عطا کی تھی، چناں چہ اپنی گفتگو سے وہ مختلف مسائل و معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ آپ کے والد نے معاشرے کی تنقید سے بچنے کے لیے بیٹی کو ابتدائی تعلیم گھر پر ہی دینے کا فیصلہ کیا۔ فاطمہ جب دو سال کی تھی تو والدہ وفات پا گئیں۔ اب 1901ء میں آٹھ سال کی عمر میں والد بھی انتقال کر گئے تو بہن کی تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری بڑے بھائی محمد علی جناح پر آن پڑی۔

محمد علی جناح چاہتے تھے کہ بہن کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے انگریزی اسکول میں داخل کرایا جائے۔ معاشرتی و خاندانی دباؤ کے بعد محمد علی جناح نے فاطمہ جناح کو بددل ہوتے دیکھا تو ان کا حوصلہ بڑھایا۔ آپ چاہتے تھے کہ بہن پر انگریزی تعلیم کا فیصلہ زبردستی نہ تھوپا جائے بلکہ ایسا ماحول دیا جائے کہ وہ از خود اس طرف راغب ہوں۔

بہن کی ہچکچاہٹ دور کرنے کے لیے بھائی نے یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا کہ ایک دن فاطمہ کو بگھی میں بٹھا کر ممبئی کے مشہور باندرہ اسکول تک لے گئے۔ وہاں تھوڑی دیر کے لیے بگھی روک دی۔ فاطمہ نے دیکھا کہ بہت سی بچیاں جو ان کی ہم عمر تھیں، خوب صورت لباس پہنے لکھنے پڑھنے میں مصروف تھیں، کچھ بچیاں میدان میں کھیل رہی تھیں۔ بھائی نے بہن کو اسکول کے مختلف حصے بھی دکھائے اور ظاہر یہی کیا کہ یہ محض ایک سیر تھی۔

بھائی نے یہ عمل کئی بار دہرایا۔ وہ بگھی کو سیر کراتے کراتے اسکول تک لے جاتے اور وہاں پہنچ کر بگھی روک دیتے۔ فاطمہ جناح بچیوں کو پڑھتے لکھتے اور کھیلتے کودتے دیکھتی رہتی۔ آہستہ آہستہ فاطمہ کی ہچکچاہٹ و خوف دور ہو گیا اور انہوں نے خود ہی بھائی سے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ ان بچیوں کے ساتھ پڑھنا چاہتی ہیں۔

چناں چہ محمد علی جناح نے انہیں ممبئی کے باندرہ کانونٹ اسکول میں داخل کروا دیا اور بورڈنگ میں ان کی رہائش کا بھی انتظام کر دیا۔ چھٹی والے دن یعنی اتوار کو بھائی بہن سے ملنے ضرور جاتے اور ان کی ہمت و حوصلہ افزائی کرتے۔

"جو بھی فیصلہ کر لیا جائے، اس پر سختی سے قائم رہنا چاہیے۔" یہ عملی زندگی کا وہ پہلا سبق تھا جو فاطمہ نے اپنے بھائی سے حاصل کیا۔ پڑھائی پر توجہ، اچھے اخلاق و کردار سے بہت جلد فاطمہ نے اپنے استادوں کے دل میں جگہ بنالی۔ سچ بولنے اور ہر ایک کے کام آنے سے فاطمہ ہر ایک کی ہر دل عزیز بن گئی۔ چناں چہ جب بھی بھائی ان سے ملنے آتے تو فاطمہ کے استاد اس کی بے حد تعریف کرتے۔

کانونٹ اسکول میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد محمد علی جناح نے انہیں سینٹ پیٹرک اسکول کھنڈالا میں داخل کرا دیا۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے فاطمہ کے استاد، محمد علی جناح سے کہتے کہ وہ بہن کی تعلیم جاری رکھیں۔ سینٹ پیٹرک اسکول سے 1910ء میں فاطمہ جناح نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ یہاں بھی انہوں نے بورڈنگ میں ہی قیام کیا۔ میٹرک کے بعد وہ اپنے بھائی محمد علی جناح کے پاس آ گئیں۔ محمد علی جناح کے لیے اپنے عدالتی و وکالتی مصروفیات میں سے وقت نکالنا بہت مشکل تھا مگر پھر بھی وہ اپنی چھوٹی بہن کے لیے کچھ نہ کچھ وقت ضرور نکال لیتے۔ فاطمہ سے ڈھیروں باتیں کرتے، ہلکے پھلکے مزاج سے ان کی دل جوئی کرتے۔ یوں فاطمہ کو محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ اس پر توجہ نہیں دے رہے۔

محمد علی جناح جب صبح ہائی کورٹ جاتے تو فاطمہ جناح کو بھی بگھی میں

بٹھا لیتے تا کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں خود کو اکیلا محسوس نہ کریں۔ راستے میں وہ فاطمہ کو بڑی بہن، بیگم مریم عابدین کے ہاں چھوڑ دیتے تا کہ وہ بہن اور ان کے بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی دن گزاریں۔ عدالت سے واپسی پر فاطمہ جناح کو وہاں سے لے لیتے، تھوڑا وقت سیر و تفریح میں گزارتے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے گھر پہنچتے۔ کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرتے اور شام کو سیر کے لیے نکل جاتے۔ اس عرصے میں فاطمہ جناح اپنی پڑھائی سے دور نہ ہوئیں۔ انہوں نے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر سینئر کیمبرج کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ اپنی بہن کے گھر کتابیں لے جاتیں اور فراغت میں پڑھائی شروع کر دیتیں۔ 1913ء میں انہوں نے نجی امیدوار کے طور پر امتحان پاس کیا۔ محمد علی جناح نے نتیجہ دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور چھوٹی بہن کو مبارک باد کے ساتھ تحائف بھی دیے۔

بچپن میں بہترین تعلیم و تربیت دینے والے بھائی کو عملی زندگی میں جب بہن کے ساتھ کی ضرورت پڑی تو بہن نے بھرپور ساتھ دیا۔ بہن بھائی کے مشاغل ایک جیسے تھے۔ دونوں مطالعے کے شوقین تھے تو دونوں کا پسندیدہ موضوع سیاست ہی تھا۔ فاطمہ جناح نے اپنا ڈینٹل کلینک چھوڑ کر بھائی کی بڑھتی ہوئی سیاسی مصروفیات میں ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ تحریک پاکستان کے ہر محاذ پر بھائی کے شانہ بشانہ رہیں۔ فاطمہ جناح نہ صرف ان کے معمولات و مصروفیات کا خیال رکھتیں بلکہ مفید مشورے بھی دیتیں۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم کی بیماری کے ایام میں ان کی تیمارداری کا فریضہ فاطمہ جناح نے بخوبی نبھایا۔ عظیم بھائی کی عظیم بہن نے اپنی زندگی لوگوں کی بہتری و بھلائی کے لیے وقف کر دی۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے صدارتی انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ کراچی میں پیدا ہونے والی فاطمہ جناح نے آخری سانس بھی کراچی میں ہی لیا۔ 9 جولائی 1967ء کو ان کا انتقال ہوا اور انہیں ان کے بھائی قائداعظم محمد علی جناح کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

☆

کہانی "اجالا کہاں ہے؟" کا بقیہ حصہ

ان کا بہت خیال رکھتے ہیں، میرے اندر بھائیوں سے نفرت کا جو لاوا پک رہا تھا، وہ ایک جانب بیٹھنا شروع ہوا۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ محض چند لوگوں کے غلط رویے کی سزا سارے معاشرے کو دینا کسی طور درست نہیں۔"

"ہوں!" ایک بچے نے ہنکارا بھرا۔

"میں نے تم لوگوں کو بھی اپنی نفرت کی بھینٹ چڑھایا۔ تم نے بھی بہت سے حسین خواب دیکھے ہوں گے لیکن مجھ جیسے گناہ گار نے تمھیں بھکاری بنا دیا۔ میں جن اُجالوں کی تلاش میں نکلا تھا وہ خود تو نہ پا سکا بلکہ دوسروں کو بھی اس سے محروم کر دیا۔"

"اللہ آپ پر رحم فرمائے۔" نصیر بھی چپکے سے بول پڑا۔

"اب میں نے دل میں ٹھان لی ہے کہ تم لوگوں کو اُجالے کی طرف لے جاؤں گا۔"

"وہ بھلا کیسے؟"

"ہماری منزل تو ہمارے گھر میں ہے۔ والدین کی مار اور سختی میں بھی اپنائیت ہوتی ہے۔ ماں باپ کی مار بہتر ہے لیکن گھر سے بھاگ کر اپنی زندگی برباد کرنا کسی طور بھی عقل مندی نہیں۔"

"تو اب آپ کیا کریں گے؟" نصیر نے سوال کیا۔

"میں تم سب کو تمہارے گھروں تک پہنچاؤں گا۔" اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "تمہارے والدین سے مل کر تمہارے مسائل حل کرانے کی کوشش کروں گا۔" اس کے ارادے نیک تھے۔

"ہم اپنے گھر جائیں گے؟" یاسر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔

"میں اپنے گھر جا سکوں گا۔" نفیس نے تو فوراً جیسے جانے کی تیاری شروع کر دی۔

"میرا گھر......" ایک اور لڑکا بھی خوشی سے بولا۔

"مجھے بھی امی بہت یاد آ رہی ہے۔" جنید تو آنسوؤں سے رو دیا۔

اس کے اس اعلان نے بچوں کے اندر خوشی کی نئی لہر دوڑا دی۔ وہ سب ایسے ہو گئے جیسے آج ہی انہوں نے اس دنیا میں جنم لیا ہو۔ اُستاد خاموشی سے اُٹھا اور اپنے ارادے کی تکمیل کی تیاری کرنے لگا۔ اس کا فیصلہ تھا کہ وہ اب بچوں کو اندھیروں سے اجالوں کی طرف لے جائے گا۔

❁❁❁❁

رائنو گینڈے کی ایک قسم ہے جس کے ماتھے پر ایک سینگ ہوتا ہے۔ گینڈے کی یہ قسم آہستہ آہستہ دُنیا سے ناپید ہوتی جا رہی ہے اور اب انڈونیشیا کی حکومت اسے بچانے پر خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ گینڈے کی یہ نسل صرف انڈونیشیا کے ایک جزیرے جاوا میں پائی جاتی ہے۔ 1932ء میں گینڈے کے شکار پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ انڈونیشیا میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے۔ یہ ماہِ رمضان کا واقعہ ہے۔

اس دن میں اپنے معمول سے ہٹ کر صبح دیر سے بیدار ہوا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور فضا میں حدت بڑھ رہی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نہا کر تیار بھی ہو گیا مگر دُور دُور تک میرے ناشتے کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں اسی طرح حیران باہر باغیچے میں نکلا اور پھر پورے گھر کے گرد چکر لگایا۔ باورچی خانے کی کھڑکی سے جھانکا لیکن باورچی خانے میں کچھ پکنے کی خوشبو نہیں آ رہی تھی۔ اسی حیرانی میں میں نے سگریٹ لگایا اور اسی وقت موسو اور ڈیٹ جی باغیچے میں داخل ہوئے۔ موسو مجھ سے حیران ہو کر پوچھنے لگی کہ تم سگریٹ کیوں پی رہے ہو؟ میں نے اسے بتایا کہ مجھے ناشتے سے پہلے ایک سگریٹ پینے کی عادت ہے تو اس نے مجھے یاد دلایا کہ آج پہلا روزہ ہے۔ میں ذہنی طور پر خجل ہو کر سوچنے لگا کہ میں کیسے بھول گیا؟ میں نے موسو کو بتایا تو اس نے کہا کہ اگر تم بھول گئے ہو تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں نے موسو کو آگاہ کیا کہ میں نے رات تراویح بھی ادا نہیں کیں اور اب بھوک سے میرا بُرا حال ہے، تب ڈیٹ جی اس گفتگو میں شریک ہوا۔ اس نے مجھے کہا کہ اگر میں روزہ نہیں رکھ سکا تو پھر کوئی بہانہ نہیں کرنا چاہیے۔ آؤ باورچی خانے میں جا کر دیکھتے ہیں کہ شاید وہاں رات کا کچھ بچا ہوا ہو۔

باورچی خانے میں ہمیں تھوڑا سا سوپ اور کچھ اُبلے ہوئے چاول ملے جنہیں میں نے بادل نخواستہ زہر مار کیا۔ پھر ہم باورچی خانے سے نکلے اور ایک نرسری کے قریب سے گزرے تو ہم نے بوڑھے سوانتا کی آواز سنی۔ وہ وہی قصہ سنا رہا تھا، جس میں اس کے پیچھے ایک گینڈا لگ گیا تھا۔ لوگ یہ قصہ سن کر ہنس رہے تھے۔ ہم وہیں رُک گئے اور سوانتا کو کہا کہ وہ ہمیں یہ قصہ دوبارہ سنائے۔ اس نے ہمارے لیے قصہ دوبارہ شروع کیا۔

"بہت سال پہلے کی بات ہے جب میں جوان تھا، تب یہ افواہ گردش میں تھی کہ قریبی جنگل میں کچھ گینڈے دیکھے گئے ہیں۔ ہمارا مالک جو ڈیٹ جی کا باپ تھا، اس نے ایک شخص کو جنگل کا جائزہ لینے

بھیجا۔ اس کے ساتھ تین شکاری بھی کر دیے تا کہ ان جانوروں کے قدموں کے نشانات کی شناخت کر سکیں۔ یہ شخص جنگل کا چپہ چپہ جانتا تھا۔ جب وہ آدمی واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گینڈوں کے قدموں کے نشان جھیر وزئم جوہڑ کے اردگرد موجود ہیں اور بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے گینڈوں کے قدموں کے نشان بھینسوں کے قدموں سے زیادہ زمین میں دھنسے ہوئے ہیں۔

ڈیٹ جی کے والد نے ایک رپورٹ بنا کر ضلعی اور صوبائی حکومت کو ارسال کی اور تین دن کے اندر اندر وائسرائے اور سرکاری افسران گینڈے کے شکار کے لیے پہنچ گئے۔ مالک نے اردگرد کے دیہات کے مکھیا طلب کر لیے اور ان عزت مآب مہمانوں کے آگے آگے شکاریوں، ہانکے والوں اور سامان اٹھانے والوں کی فوج بھی آ گئی۔

صبح کے وقت جب سب اکٹھے ہو گئے تو یہ قافلہ جنگل کی طرف چلا۔ سرکاری افسران گھوڑوں پر سوار تھے، پیچھے پیچھے گاؤں کے لوگ پیدل روانہ تھے۔ انہوں نے بھالے، نیزے اور بانس سے بنے ڈھول اٹھا رکھے تھے۔ قلی کھانے کا سامان اور بستر وغیرہ اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ نہتے تھے، ان کے واحد ہتھیار ان کی ماچسیں تھیں جن سے کھانا بنانے کے لیے انہوں نے آگ جلائی تھی۔ آپ کو پتا ہے دوسرے جانوروں کے شکار سے گینڈوں کا شکار مختلف ہوتا ہے۔ آپ کو جنگل میں جا کر مختلف کام کرنے پڑتے ہیں، آپ کے پاس کم از کم تین چار دن کا کھانے کا سامان ہونا چاہیے۔ لہٰذا ہمارے پاس بھی چاولوں کی بوریاں ایک کمرے میں محفوظ تھیں۔"

"اور تمہارے پاس کیا تھا؟" میں نے سوانتا کو کہانی کے درمیان ٹوکا تو اس نے کہا۔ "کچھ نہیں، صرف مالک کی بندوق اور کچھ گولیاں۔"

"تو تمہارے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔" میں نے سوال کیا تو سوانتا نے بتایا کہ مالک کے پاس اس کے ذاتی ملازم تھے جو کھانا بناتے تھے اور مالک اتنا رحم دل تھا کہ وہ ہمیں کھانے میں بہت کچھ دے دیتا تھا۔ بوڑھا سوانتا دوبارہ اپنی کہانی سنانے میں مصروف ہو گیا۔

ابھی صبح ہی ہوئی تھی کہ ہم جنگل میں پہنچ گئے۔ گرمی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ہم نے عارضی جھونپڑیاں بنانا شروع کر دیں جہاں سب نے رات کو قیام کرنا تھا۔ جب گاؤں کے لوگ پہنچے تو انہیں مختلف گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پھر وہ گروپ مختلف سمت میں پھیل گئے۔ صرف وہی لوگ وہاں رہ گئے جو جھونپڑی نما گھر بنا رہے تھے۔ ہر گروپ کے ساتھ ایک گاؤں کا مکھیا اور ایک سرکاری افسر جو اسلحہ سے لیس تھا۔ ان سارے گروپوں کے پاس سب ملا کر بیس بندوقیں تھیں۔ وائسرائے اور دوسرے سرکاری ملازمین بھی اس خفیہ مقام کی طرف روانہ ہو گئے جہاں ان کے بیٹھنے کے لیے زمین سے بلند مچان بنائی گئی تھی۔

مچان کیا تھی، ہوا میں معلق ایک گھر بنا دیا گیا تھا جسے قریبی درختوں کے تنوں کے ساتھ رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ شکاریوں کو واضح شکار نظر آنے کے واسطے مچان کے سامنے کی جھاڑیاں کاٹ دی گئی تھیں تا کہ وہ آسانی سے نشانہ باندھ سکیں۔ یہ چھپنے کے لیے اب بڑی زبردست جگہ تھی۔ اگر ان شکاریوں کی رائفلوں کی پہنچ میں کوئی گینڈا آتا تو وہ ان کے ایک اچھے نشانے کی مار ہوتا۔ سارا دن دُور دُور ہر طرف ڈھول تاشوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ یہ ہانکا کرنے والوں کی آوازیں تھیں جو گینڈوں کو ہانک کر مچان کی طرف لا رہے تھے۔ اگرچہ اس دن کوئی نتیجہ نہ نکل سکا تو اگلے دن پھر یہ تماشا شروع ہو گیا۔ ہانکے والوں کی آوازیں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگیں لیکن اس دن بھی کوئی گینڈا نظر نہ آ سکا۔ اگلے دن صبح سویرے قریبی گاؤں سے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے ہمیں بتایا کہ گینڈے گاؤں کے نزدیک دیکھے گئے ہیں۔ کھوجی بھیجے گئے تو انہوں نے بتایا کہ گینڈے گاؤں سے اسی طرف آئے ہیں، جدھر مچانیں لگی ہیں۔

ہانکا کرنے والوں نے جنگل میں بنائی ہوئی جگہ سے ہانکا کرنا شروع کر دیا۔ کھوجیوں نے تہیہ کر لیا کہ اس بار وہ گینڈوں کو غائب نہیں ہونے دیں گے۔ اب سب کو یقین تھا کہ گینڈے ہانکے کے درمیان موجود ہیں۔ مچان پر بڑے مشاق شکاری موجود تھے اور سب شدت سے گینڈوں کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر جنگل میں مغرب اور مشرق کے اطراف کی جھاڑیوں کو آگ لگائی گئی۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی جس نے آگ کو اور تیز کر دیا اور آسمان کی طرف دھواں جانا شروع ہو گیا۔ آگ کے پھیلنے سے ہر طرف جھاڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں آنے لگیں اور دھویں سے آسمان کا رنگ سیاہ ہونے لگا اور جب دونوں

سمت سے لگی آگ نے دائرہ بنایا اور ہانکا کرنے والوں کا گھیرا تنگ ہونے لگا تو اچانک ایک رائفل کی گولی کی آواز فضا میں گونجی۔ ایک درخت کی شاخ پر دل تھام کر بیٹھے رہنا، خصوصی طور پر جب وہ زور سے دھڑک رہا ہو بڑا دل گردے کا کام ہے۔ میں نیچے اتر آیا اور شور مچانے والوں میں شریک ہو گیا۔ ہمیں جلتی فضا میں بھی گینڈے اپنی طرف آتے محسوس ہو رہے تھے۔ ایک ہجوم خشک جگہ پر کھڑا ہو کر شور مچا رہا تھا۔ اس جگہ پر چھوٹے چھوٹے درخت اور گھنی جھاڑیاں تھیں۔ گینڈے اچانک مشرق کی طرف سے نمودار ہوئے اور ایسے لگ رہا تھا جیسے سڑک بنانے والے بلڈوزر بھاگ رہے ہوں۔

لوگ گینڈوں کو دیکھ کر بے اختیار چلا رہے تھے۔ گینڈے مغرب کی طرف چلے گئے۔ وہ تین تھے ایک نر، ایک مادہ اور ایک بچہ، جب انہوں نے دیکھا کہ ہجوم انہیں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے تو وہ واپس مشرق کی طرف مڑے جہاں سے وہ آئے تھے۔ پھر وہ جنگل کے کنارے پر رکے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ آگ سے خائف ہیں۔ دھویں سے سانس بند ہو رہا تھا، لہٰذا وہ دوبارہ مغرب کی طرف مڑے لیکن لوگ اُدھر بھی ان کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ آخر راستہ بھولنے والوں کی طرح وہ میدان میں کھڑے ہو گئے۔ نر کا منہ کھلا تھا اور میں آج تک اس کے چہرے کی سرخی اور اس کے خوف ناک دانت نہیں بھولا۔ مہمانوں نے لوگوں کو چیخ کر گینڈوں کے نزدیک ہونے کو کہا۔ اتنی دیر تک شعلوں اور دھویں نے ایک سیاہ دیوار بنالی تھی۔ جھاڑیاں راکھ میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ گینڈوں کی چھٹی حس انہیں سمجھا چکی تھی کہ وہ خطرے میں ہیں۔ ان کے نکلنے کا راستہ شمال کی طرف تھا لیکن حیرانی کی بات تھی وہ اُدھر جانا نہیں چاہتے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے انہیں پتا چل گیا ہو کہ وہاں شکاری گھات لگائے بیٹھے ہیں اور جیسے وہ جنوب و مغرب کی سمت بھاگنے کی تیاری میں ہوں۔ اس وقت تقریباً ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ اسی وقت ایک ڈھول کی آواز ہوا میں گونجی جسے سن کر نر گینڈے نے گویا ایک جھرجھری لی اور مغرب کی طرف بھاگا۔ اس نے لوگوں کی موجودگی کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ پھر ایک دفعہ وہ چنگھاڑا جیسے وہ اپنی مادہ اور بچے کو بلا رہا ہو۔ وہ تینوں ایک قطار میں بھاگنے لگے۔ بچہ ان دونوں کے درمیان میں تھا اور وہ لوگوں کے بیچ میں سے راستہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ لوگ بھونچکا رہ گئے۔ کئی لوگ ان سے بچنے کے لیے زمین پر گرے ہوئے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میرا دماغ بھی ماؤف ہو گیا۔ میں بھاگ کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ ایک شاخ کے ساتھ مضبوطی سے لپٹ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے

لگ رہا تھا جیسے گینڈے بالکل میرے پیچھے کھڑے ہیں اور زور زور سے ہانپ رہے ہیں۔ پھر مجھ پر جیسے غنودگی سی طاری ہو گئی اور میرے ہاتھ سے درخت کی شاخ نکل گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں گینڈے کی پیٹھ پر بیٹھ گیا ہوں لیکن دراصل میں لاہیام کے اوپر گرا تھا جو مجھ سے نیچے درخت سے لپکا ہوا تھا اور وہ لاہیام ہی تھا جس کے ہانپنے کی آواز میں سن رہا تھا۔ میرے گرنے سے لاہیام نے شور مچا دیا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ دوسرے لوگ بھی اتنے ہی خوف زدہ تھے جتنا کہ میں۔

لاہیام اٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے سنا کہ ہجوم میں موجود کئی سورماؤں کا پیشاب کپڑوں میں ہی نکل گیا تھا اور یہ شکاری تھے جو سب سے تیز بھاگ کر درختوں پر چڑھ گئے تھے۔ ایک سرکاری ملازم جو علاقے میں بڑا دلیر مشہور تھا اس نے جیسے ہی دیکھا کہ گینڈے اس کی طرف آ رہے ہیں، اس نے اپنی رائفل ایک طرف پھینکی اور بھاگ کر قریبی درخت پر چڑھ گیا۔ لوگوں نے شور مچایا کہ رائفل تو لے لو مگر اس نے کہا کہ اسے ضرورت نہیں ہے، اگر کسی کو چاہیے تو وہ لے سکتا ہے۔ گینڈوں کا خاندان تک جنگل غائب ہو چکا تھا۔ سب درختوں سے نیچے اتر آئے اور اکٹھے ہو گئے۔ اب جب کہ گینڈے دور جا چکے تھے، سبھی اپنی بہادری کے قصے سنانے میں مصروف تھے۔

ہم واپس اپنے کیمپ میں آ گئے۔

وائسرائے بہت شرمندہ تھے۔ انہوں نے ڈھول والے کے ذریعے لوگوں کو جانوروں کے نزدیک ہونے کو کہا تھا جس سے گینڈے بچ پا ہوئے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اب ان کا پیچھا کرنا بے سود ہے، رات کے نو بجے ہم گھر واپس آنے کے لیے روانہ ہوئے اور سفر کر کے گھر پہنچے تو صبح اذانیں ہو رہی تھیں۔ اتنی تکلیفیں اٹھانے کے باوجود ہم خالی ہاتھ لوٹے تھے۔ سارے راستے واپسی پر میں جب بھی کسی کالی چیز کو حرکت کرتے دیکھتا، مجھے وہ گینڈا ہی لگتا اور میرا کلیجہ منہ کو آتا۔

''سوانتا! معلوم ہوتا ہے تمہاری قسمت بھی میری طرح خراب ہے۔'' میں نے سوانتا کو کہا۔ میں نے نر گینڈے کے سائز کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ بہت بڑا تھا۔ ایک جنگلی بھینسے سے بھی بڑا، وہ دس فٹ لمبا ہوگا۔ اس کی گردن بہت بھاری تھی۔ سر پر کوئی بال نہیں تھا۔ لمبی تھوتھنی، مڑا ہوا سینگ اور اس کی آنکھوں کو دیکھنے سے خوف طاری ہوتا تھا۔

پھر موسو نے پوچھا کہ اس کے دانت کیسے تھے؟

''میں نہیں جانتا میں نے انہیں صحیح طرح نہیں دیکھا۔ اس کے دانت سؤر کی طرح تھے مگر ان سے کہیں بڑے اور خوف ناک۔'' سوانتا نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

''اور بچہ؟'' موسو نے پھر پوچھا۔ ''وہ چھوٹا تھا جیسے ایک جوان بھینس ہوتی ہے۔'' ''میں زندگی میں کئی دفعہ گینڈے کے شکار پر گیا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد مجھے کبھی گینڈے کے شکار کی پیش کش ہوئی تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ سوانتا نے فیصلہ کن انداز میں کہانی کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''کھوج لگایئے'' میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

حنیف انوار، رحیم یار خان۔ ہمایوں اسلم چوہدری، قصور۔ عائشہ صدیقہ، خوشاب۔ شیرونیہ ثناء، حیدرآباد۔ اہل علی، اوکاڑہ۔ محمد حمزہ منصور، لاہور۔ مریم شبیر، چیچوت، گوجرانوالہ۔ عثمان غنی فرزند علی، لاہور۔ طلحہ سہیل، اسلام آباد۔ عافیہ سلمان، کراچی۔ خدیجہ ماہ نور، فیصل آباد۔ حارث نعیم، لاہور۔ محمد باسط خان، میانوالی۔ کشف طاہر، لاہور۔ عبید شریف صدیقی، ہرنولی۔ حافظ محمد منیب، وزیرآباد۔ حاطب بن اویس، راولپنڈی۔ سلمان مزمل، لاہور۔ ثمرن عظیم، اسلام آباد۔ محمد فرحان، واہ کینٹ۔ حسن بشیر، سیالکوٹ۔ حماد علی کاوش، شیخوپورہ۔ اریدہ فاطمہ، ستیانہ بنگلہ۔ افراح اکبر، لاہور۔ منورہ ثاقب، واہ کینٹ۔ رمشاء کنول، چک جھمرہ سٹی۔ محمد صادق علی، کوٹری۔ سعیدۃ النساء۔ علی حمزہ بھٹہ، راولپنڈی۔ مومنہ ذوالفقار، بہاولپور۔ حفصہ ارشد، پشاور۔ اریبہ ذوالقرنین، بہاولپور۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ ندا خان، پشاور۔ عمار یاسر، لاہور۔ زویا احمد، گوجرانوالہ۔ رابیکا شاہد شیخ، گوجرانوالہ۔ ساویہ سعد، لاہور۔ عل ہما، سرگودھا۔ اسجد علی، گجرات۔ ثوبیہ انوار، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ مظہر حسین، گوجرہ۔ طلعت ایوب، کوٹری۔ سلمان سعید، تربیلا۔ ام سلمہ، میانوالی۔ نورا کینہ جمیل، لاہور۔ ربیعہ نورین، فیصل آباد۔ طالحہ، ڈسکہ۔ صائمہ نسرین، کراچی۔ سحر نذیر، کوئٹہ۔ دلشاد ناز، بھیرہ۔ ذیشان سعید، سرگودھا۔ آفاق احمد، گجرات۔ صوبیہ یونس، فیصل آباد۔ افتخار خالد، کراچی۔ ناہید کوثر، پشاور۔ راجہ اشفاق احمد، راولپنڈی۔ ماہ نور، شاہ کوٹ۔ عائشہ انور، اسلام آباد۔ عیسیٰ خان، ایبٹ آباد۔ محمد جاوید اسماعیل، سیالکوٹ۔ الیاس حیدر، گجرات۔ محمد ریحان بٹ، جہلم۔ محمد حارث سعید، پنڈی بھٹیاں۔ قسیم حیدر، ملتان۔ فاطمہ محمود، خانیوال۔ شیزہ طارق، کراچی۔ بینش اکرم، واہ کینٹ۔ احسن سعید، کراچی۔ اظہر ہاشمی، وزیرآباد۔

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 جولائی 2014ء ہے۔

جون 2014ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلس ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- حکومت نے نہ سنی عوام کی فریاد، عوام نے خود کرلی نئی چیز ایجاد۔ (محمد صادق علی، کورنگی)
- قربان جاؤں عقل پر تمہاری، لوڈشیڈنگ سے چھٹکارا اور ورزش بھی جاری۔ (طاہر حسن، لاہور)
- یہ ہے ہمت فین، جتنی ہمت اتنا چین۔ (محمد اسد سلیم، قصور)
- بھائی نے تھوڑی عقل لڑائی، ورزش کے ساتھ بجلی ہوا بھی چلائی۔ (احسان غنی، لاہور)
- پاؤں سے پیڈل گھمایا اور گرمی کو دور بھگایا۔ (محمد قمر زمان، خوشاب)